آغا شاعر

حیات و شاعری

مرتبہ

مجتبیٰ حسین

مکتبہ دانیال

آغا شاعر داغ اسکول کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔
آغا شاعر کے بعد اور خود ان کے زمانہ میں نئے کہنے والوں کے لئے جو زمین ہموار ہو رہی تھی اس کے ہموار کرنے میں آغا شاعر کی محنتوں کا بھی دخل ہے اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں کوشش کی گئی ہے کہ ایسے مضامین یکجا کر دیئے جائیں جن سے ذاتی اور صفاتی زندگی دونوں کا احاطہ ہو سکے۔
آغا صاحب پر متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں ان میں سے چند آپ کو اس کتاب میں مل جائیں گے۔ ان مضامین کے لکھنے والوں میں آغا شاعر کے احباب، ان کے معاصرین ان کے استاد بھائی اور اردو کے بعض اہم ناقدین شامل ہیں

مجتبیٰ حسین

قیمت

آغا شاعر

حیات
و
شاعری

مرتبہ

مجتبیٰ حسین

طبع اوّل

۱۹۷۰ء

قیمت چھ روپے

ناشر مکتبہ دانیال - وکٹوریہ چیمبرز ۲ وکٹوریہ روڈ - کراچی

پرنٹر: مستفیض احمد صدیقی، انٹرنیشنل پریس کراچی

ترتیب

منظوم ترجمہ قرآن مجید کے متعلق چند آرار



حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی

کچھ تالیف کے بارے میں

ادب شناسی اور ادب دوستی کے سلسلے میں ایک سوال پر ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ کیا صرف صفِ اوّل کے ادبا اور شعرا ہی کو پڑھنا اُن کی تخلیقات سے بحث کرنا اور انہیں سے متعلق تصنیف و تالیف کے سلسلے کو جاری رکھنا ادبی معیار کی بلندی اور ادبی ذوق کی ترویج اور ترقی کی ضمانت ہے؟ اس سوال کو زیادہ واضح طور پر یوں سمجھیے کہ کیا سالک، مجروح، رند، صبا، وزیر، ریاض خیرآبادی، منیر لکھنوی، حفی عزیز، ثاقب، بیخود، سائل وغیرہ کو بھول جانا ہماری ادبی یادداشت اور تربیت کے لئے سودمند ہے؟ اگر یہ سوال اب بھی کچھ اُلجھا ہوا معلوم ہو تو پھر یوں سمجھئے کہ کیا صفِ اوّل کے شعرا کا تعین صفِ دوم یا صفِ سوم کے شعرا کے بغیر ممکن ہے؟ یا ادب کی کسی مجموعی تہذیبی فضا

تصوّر کے بغیر مرزا غالب کا سمجھنا اور انہیں شعری روایات سے الگ کرکے دیکھنا اور پھر پسند کرنا ممکن ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ ادبی تاریخ کی نفی اور اُن اجزائے ترکیبی سے بے خبری ہے جن سے بڑا شاعر تشکیل پاتا ہے۔ ہر دور کا بڑا شاعر اپنے دَور کے تمام دوسرے شعراء کے ساتھ ہی اُبھرتا ہے۔ ادبی تاریخ تین چار شاعر اور ادیب کے وجود سے مل کر نہیں بنتی اسکی ترتیب اور ارتقا میں چھوٹے بڑے تمام شعرا اور ادبا کی کوششیں شامل رہتی ہیں۔

داؔغ کو سمجھنے اور پسند کرنے کے لئے صرف اُن کے دواوین کو پڑھنا کافی نہیں ہے۔ ہمیں اُستاد ذوقؔ کو بھی پڑھنا ہوگا۔ داؔغ کے عہد کو بھی سمجھنا ہوگا اور اُن کے مشہور شاگردوں کے کلام کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ ان مراحل سے گزرنا اگر دشوار معلوم ہوتا ہو اور محسوس ہوتا ہو کہ انہیں کے لئے مدّت درکار ہے تو پھر بہتر یہ ہے کہ اربابِ نشاط سے داؔغ کی غزلیں سُن لی جائیں اور ادب دوستی اور سخن شناسی کے دعدوں کو ختم کرکے سیدھی راہ اختیار کی جائے جہاں ادب یا تفریح ہوتا ہے یا فیشن۔ میرؔ و غالبؔ کا بار بار حوالہ دینے والوں یا اُن پر مضمون لکھنے والوں سے اگر یہ گزارش کی جائے کہ بندہ نواز آپ کا علم و فضل تسلیم۔ آپ کو ادب میں

بڑا درک حاصل ہے اور آپ ادب کے بہت بڑے پارکھ ہیں اگر زیادہ نہیں صرف ایک صفحہ وزیر یا رند یا مجروح پر لکھ دیجئے تو یقین مانئے کہ انہیں آپ کی فہمائش سے اور آپ کو اُن کی معذوری سے بڑی مایوسی ہوگی۔

آغا شاعر پر اسی لئے یہ تالیف ضروری ہو جاتی ہے۔ آغا شاعر داغ اسکول کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ آغا شاعر کے کلام کی پہلی اہمیت یہ ہے کہ خود اپنی جگہ یہ مستند، پختہ اور تیکھا کلام ہے۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ داغ کے شعری کمالات کی نشان دہی کرتا ہے۔ تیسری اہمیت یہ ہے کہ آغا شاعر کے بعد اور خود ان کے زمانے میں نئے کہنے والوں کے لئے جو زمین ہموار ہو رہی تھی اس کے ہموار کرنے میں آغا شاعر کی محنتوں کا بھی دخل ہے۔

آغا شاعر کو بھول جانا اور اپنے دور کے بہت سے غیر اہم اور غیر معتبر کہنے والوں کو یاد رکھنا ادب و شعر کے حق میں فال نیک نہیں ہے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں کوشش کی گئی ہے کہ ایسے مضامین یکجا کر دئے جائیں جن سے آغا شاعر کی ذاتی اور صفاتی زندگی کا احاطہ ہو سکے آغا شاعر پر متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں اُن میں سے چند آپ کو یہاں مل جائیں گے ان مضامین کے لکھنے والوں میں آغا شاعر کے احباب ان کے معاصرین، اُن کے استاد بھائی اور اردو کے بعض اہم ناقدین ہیں۔

یہ تالیف یقیناً تشنہ ہے۔ کیونکہ ابھی بہت سے اچھے مضامین جو اِدھر اُدھر پرانے رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں اس میں شامل نہیں کئے جا سکے۔ ان مضامین کا جمع کرنا ضروری ہے۔ مگر فی الحال بعض موانع کی بنا پر انہیں حاصل کرنا ممکن نہیں۔

میرے عزیز دوست آغا شاعر کے منجھلے صاحبزادے جناب آغا سرخوش قزلباش اگر اس سلسلے میں توجہ اور امداد نہ فرماتے تو اس کتاب کی تالیف محال ہوتی۔

اُمید ہے کہ آغا شاعر کے سلسلے میں آئندہ لکھنے والوں کے لئے یہ تالیف اوّلین اور بنیادی ادبی دستاویز کی حیثیت اختیار کرے گی۔

مجتبیٰ حسین

۱۸ر نومبر ۱۹۶۹ء

پیش لفظ

شاہد احمد دہلوی

اللہ کسی کی بنا کر نہ بگاڑے، آغا شاعر قزلباش دلّی کی اُن بے مثل ہستیوں میں سے تھے، جن پر دلّی کو فخر تھا۔ اُردو کو فخر تھا، ہندوستان کو فخر تھا۔ آغا جب شہرت کے پر لگا کر اُڑے تو اوجِ ثریّا پر پہنچ گئے۔ اور جب گرے تو تحت الثریٰ پر اُتر گئے۔ اُنہوں نے بہت اچھا زمانہ دیکھا اور بہت برا بھی، اُن کی جوانی قابلِ رشک تھی اور بڑھاپا نمونۂ عبرت۔ جوانی میں بڑے سکّے ٹھُلے کے آدمی تھے۔ میدہ و شہاب رنگ، کھُلی پیشانی۔ غلافی آنکھیں جن میں سُرخ ڈورے پڑے ہوئے، بڑی بڑی مونچھیں، گھُٹی ہوئی ڈاڑھی دوہرا ڈیل، جھوم کر چلتے تھے۔ جدھر سے گذر جاتے لوگ اُنہیں دیکھتے رہ جاتے ایسے مردانہ حُسن و وجاہت کو آغا صاحب کی رنگین مزاجی نے اور بھی نکھار دیا تھا، بے حد خوش گفتار۔ اس پر غضب ان کی شاعری کی دُھوم! لوگ اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے جس محفل میں آغا صاحب بیٹھ جاتے وہاں پھر کسی کو دم مارنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ان کا اندازِ گل افشانیٔ گفتار، سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتا تھا۔ شعر خوانی کا انداز بھی سب سے جدا گانہ تھا، بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ جس نے فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کو نہ سُنا ہو افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش کو سُن لے، داغ تو میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، ہاں آغا صاحب کو چند بار مشاعروں میں سُننے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اُن سے بہتر تحت اللفظ میں نے کسی کو پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آواز میں وہ کڑک دھمک

تھی، کہ بڑے سے بڑے مشاعرے میں بھی اُن کی آواز آخر تک پہنچ جاتی تھی (اُس زمانے میں مائیکروفون نہیں تھے) اپنا کلام سُنانے سے پہلے آغا صاحب اپنے اُستاد کے دو ایک شعر تبرکاً ضرور سُنایا کرتے تھے۔ شعر کی ادائیگی اِس طرح کرتے تھے کہ خود شعر کی تفسیر بن جاتے تھے۔ اُن کا لب و لہجہ شعر نفسِ مضمون سے اِس قدر ہم آہنگ ہوتا تھا کہ شعر میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور سننے والے تڑپ اُٹھتے تھے۔

آغا صاحب کی آشفتہ مزاجی اور سیماب وشی۔ اُنہیں چین سے کہیں بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ ابھی دلّی میں ہیں ابھی لاہور میں، ابھی حیدرآباد دکن میں ہیں، ابھی جھالاواڑ میں۔ ابھی بمبئی میں ہیں اور ابھی کلکتے میں۔ دلّی دلّی والوں کو کم ہی راس آتی تھی، آغا صاحب بچپن ہی میں گھر سے نکل گئے تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد گھر کا ماحول بگڑ چکا تھا۔ آغا صاحب ہمیشہ کے بکیلے تھے، بھلا سوتیلی ماں کے طعنے تشنے ٹھنڈے پیٹوں کیسے سُن لیتے۔؟ گھر سے نکلنے کے بعد بہت تکلیفیں اُٹھائیں، مگر نامساعد حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کرتے رہے۔ ایسے زمانے میں ان کی شاعری نے پَر پُرزے نکالے اور اہلِ ذوق اُنکی قدردانی کی طرف مائل ہوئے خوب جوان تھے جب کچھ عرصہ کے لئے اپنے اُستاد کے پاس حیدرآباد چلے گئے تھے۔ اُستاد کی قربت نے سُونے پر سُہاگے کا کام کیا۔ فصیح الملک کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں پر تھی، مگر اُستاد کا رنگ جتنا چوکھا آغا صاحب کی شاعری میں آیا ان کے کسی اور شاگرد کو میّسر نہیں ہوا، وہی شوخی، وہی چلبلا پن، وہی محاملہ بندی، وہی سادگی، وہی بے ساختگی، آغا صاحب کے کلام میں بھی دیکھ لیجئے، دلّی کا روزمرّہ اور چٹخارہ اپنے اُستاد کی طرح آغا صاحب کا بھی امتیازی وصف ہے، ہونٹوں نکلی، کوٹھوں چڑھی، ادھر داغ نے غزل کہی اور اُدھر اربابِ نشاط کے کمروں اور کوٹھوں پر

پہونچی ۔ عین مین یہی کیفیت آغا صاحب کی غزلوں کی بھی تھی ۔ کہ محفلیں اور مجرے اُن سے گونجتے رہتے تھے ، میرے بچپن میں ایک غزل ہر محفلِ نشاط میں گائی جاتی تھی۔ مطلع تھا ۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں ، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

یہ غزل میں نے حیدرآباد میں بھی سُنی تھی اور دلّی میں بھی اور اتنی بار سُنی تھی کہ اس کے کئی شعر مجھے یاد ہو گئے تھے ۔ کوئی پچیس سال کے بعد اتفاقاً معلوم ہوا کہ یہ غزل آغا صاحب کی ہے ، اگر مُلّا واحدی صاحب آغا صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ تحریر نہ فرماتے تو شاید مجھے اس کا علم بھی نہ ہوتا کہ یہ غزل کس کی ہے ، اپنی جانتمیں اسے داغ ہی سے منسوب کیے رہتا ، واحدی صاحب نے اس غزل کی شانِ نزول بھی اپنے مخصوص خوبصورت انداز میں لکھ دی ہے ۔

دکن میں آغا صاحب مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے ، یہاں انھیں ہر قسم کا آرام میسّر تھا ، مگر دلّی کی یاد نے دل میں چٹکی لی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئے ، آغا صاحب اپنی آشفتہ مزاجی سے مجبور تھے ، ساری عمر کہیں بھی ٹک کر نہیں رہے عجب توکّل کے بندے تھے ۔ لگی لگائی روزی پر لات مار کر الگ ہو جاتے تھے ، ابھی کسی رئیس کی مصاحبت میں ہیں اور ابھی اس سے اُکتا کر کسی اخبار میں کام کرنے لگے ، وہاں سے جی گھبرایا چھوڑ چھاڑ کر کلکتے پہونچ گئے ، اور تھیئٹر کے لئے ڈرامے لکھنے لگے ۔ محمد شاہ حشر نے اس صنف میں اُن کا لوہا مانا اور آغا شاعر کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ اپنا نام مختصر کر کے آغا حشر لکھنا شروع کر دیا ۔

آغا صاحب کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ دنیا ہی سے بے زار ہو گئے تھے۔ گلے میں گیروا کفنی ڈالے ننگے سر پھرنے لگے تھے۔ ایک دن بستی نظام الدین میں خواجہ حسن نظامی کے ہاں پہونچ گئے۔ خواجہ صاحب نے آغا صاحب کی طرحدار جوانی دیکھی تھی اور انہیں کینچلیاں بدلتے بھی دیکھا تھا۔ اب جو انہیں اس چولے میں دیکھا تو بے اختیار خواجہ صاحب کے منھ سے نکلا "آیئے ولدار شاہ داتا"۔ اس کے بعد خواجہ صاحب سے اُن کی گاڑھی چھنتی اور خواجہ صاحب ہی کے کہنے پر متھرا گئے اور ویدانت کی تعلیم حاصل کی، مگر بھلا ہو آشفتہ مزاجی کا کچھ دنوں بعد اسے بھی ترک کر کے پھر دنیا کے ہنگاموں سے نبرد آزمائی کرنے لگے۔

آغا صاحب نے کسی مدرسے سے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ زبان تو اُن کے گھر کی لونڈی تھی، جامع مسجد کے چوک نے اُنہیں اور بھی بنا سنوار دیا تھا، طباع اور ذہین آدمی تھے، اُنہوں نے جو کچھ سیکھا ناسازگار زمانے سے سیکھا، کسی کے کہنے سننے سے نہیں، اپنی کشمکش اور جد و جہد سے سیکھا اور ایسا سیکھا کہ شہرت اور نیک نامی حاصل کی، شہرت پر ایک واقعہ یاد آیا۔ آغا صاحب سے جب پہلی بار مجھے شرفِ ملاقات حاصل ہوا (اس بات کو اب ربع صدی ہو گئی) تو آغا صاحب نے فرمایا تھا "کبھی جوانی میں دلّی کے ایک جوہری کے سلسلے میں ایک مضمون میں میں نے "چھیجنے" کا لفظ لکھ دیا تھا۔ اُس نے مجھ پر اہانت کا مقدمہ دائر کر دیا، اُس وقت میں ڈپٹی نذیر احمد کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب بہت ضعیف ہو چکے تھے، اُنہیں دکھائی بھی کم دینے لگا تھا۔ میں نے نام عرض کیا۔ فرمایا "اوہو تمہاری شہرت تو میرے کانوں میں گھسی جا رہی ہے"۔ میں نے غرض بیان کی تو متبسم ہوئے۔ کہا "تم نے جوہری کی رعایت سے چھیجنا لکھا۔ اس سے

ہتک نہیں ہوتا۔ عدالت میں میں نے ڈپٹی صاحب کی سند پیش کی اور مقدمہ خارج ہوگیا۔

نظم میں تو آغا صاحب اپنے ہم عصروں میں سرِفہرست تھے ہی، نثر میں بھی اُنھیں کمال حاصل تھا، دلی کی ٹکسالی زبان اور ٹھیٹ محاورے لکھتے تھے۔ اُنھوں نے بے شمار مضامین لکھے، ڈرامے لکھے، مگر افسوس کہ اب اُن میں سے کوئی دستیاب نہیں ہوتا، انہوں نے ایک رسالہ "آفتاب" بھی کئی سال تک نکالا تھا، وہ بھی ماضی کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب جیسے انشاء پرداز کو آغا صاحب کی نثر کے فقرے ازبر تھے۔

آغا صاحب نے اپنی زندگی میں ہزاروں نہیں لاکھوں شعر کہے، اور یقیناً اُن کے کئی مجموعے چھپے ہوں گے مگر افسوس ہے کہ اُنھوں نے اپنا کوئی دیوان خاص اہتمام سے شائع نہیں کیا، اُن کے مشہور اُستاد بھائیوں میں سے نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے "کشکولِ سائل" شائع کیا۔ منشی وحید الدین بیخود دہلوی نے "درِ شہوارِ بیخود" شائع کیا۔ نوح ناروی نے "طوفانِ نوح" شائع کیا۔ آغا صاحب کی آشفتہ مزاجی اور لااُوبالی پن نے اُنھیں اپنے کلام کی تدوین کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

آغا صاحب کو ترجمہ کرنے میں بھی کمال حاصل تھا، رُباعیاتِ عمر خیام کے منظوم ترجمے کئی دیکھنے میں آئے مگر آغا صاحب کے ترجمے سے کسی اور کا ترجمہ لگّا نہیں کھاتا، انگریزی میں فٹز جیرالڈ کے ترجمے کو عالمگیر شہرت حاصل ہے مگر اُسے تو سرے سے ترجمہ کہنا ہی غلط ہے، اُسے اخذ ماخوذ جو جی چاہے کہہ لیجئے، ترجمہ نہیں کہہ سکتے، اُردو میں بہترین ترجمہ آغا صاحب ہی کا ہے، اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آغا صاحب کے گھر میں فارسی اُسی بے تکلفی سے بولی جاتی تھی جیسے اُردو، لہٰذا فارسی کی فہم جتنی اُنھیں تھی، کم لوگوں کو تھی، رہی اُردو وہ گھٹّی میں پڑی تھی، شاعر وہ پیدا ہی ہوئے تھے، بھلا اُن سے بازی کون لے جاتا؟

آغا صاحب کا ایک اور کارنامہ اُن کا منظوم ترجمہ کلام مجید ہے جس کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے آغا صاحب کو لکھا تھا، " آپ نے کلام اللہ کو نظم کر دیا، اب کوئی اللہ کا بندہ اسے طبلے اور سارنگی پر گا بھی دے تو مزا آجائے "، خیر یہ تو مذاق کی بات تھی، حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب سے پہلے اور آغا صاحب کے بعد بھی چند اور قادر الکلام شعراء نے کلام مجید کے منظوم ترجمے کئے ہیں، مگر آغا صاحب کا ترجمہ سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ بے شک آغا صاحب افسر الشعراء تھے، شاعری کے تاجدار تھے، یہ ترجمہ اُن کا توشۂ آخرت ہے اور اُن کی مغفرت کا ذریعہ۔

آغا صاحب کی جوانی پر تو دُنیا کو رشک آتا تھا، ادھیڑ عمر میں بھی اچھی خاصی گذری مگر بڑھاپا خراب ہو گیا، جس ریاست میں آغا صاحب کی کمان چڑھی ہوئی تھی اُس کا رئیس مر گیا اور آغا صاحب دل برداشتہ ہو کر دلّی چلے آئے، اُس وقت وہ ستّر کے پیٹے میں آ چکے تھے، صحت نے جواب دیدیا تھا اور ناداری نے چھاؤنی چھائی تھی، کچا ساتھ تھا۔ بچے کمانے دھمانے کے لائق نہیں ہوئے تھے۔ آغا صاحب کے دوست احباب اور قدردان بہت کچھ دنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ آغا صاحب کی آنکھ کا آنسو کسی وقت نہیں تھمتا تھا، جامع مسجد کو دیکھتے تو ہائے کا نعرہ لگاتے اور آنسو جاری ہو جاتے، لال قلعہ کو دیکھتے تو ہائے کا نعرہ لگاتے اور لڑیاں بندھ جاتیں۔ کسی پرانے خاندان کے فرد کو دیکھتے تو گلے لگا کر سسکیاں بھرنے لگتے، دلّی اور دلّی والوں کا غم اُنہیں کھائے جاتا تھا۔ یہی دلّی تھی جس میں آغا صاحب کا طوطی بولتا تھا، اب وہی بھری پُری دلّی ان کے لئے ویران ہو چکی تھی، ہر وقت چہکنے والا طوطی منقار زیر پَر تھا۔ آغا صاحب جتنے طرحدار اور وضعدار تھے اتنے ہی غیور بھی تھے۔ کسی سے امداد قبول نہ کرتے تھے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کا گذارہ کیسے ہوتا تھا، دلّی میں اُن کے اعجاز کے بہت سے قصے مشہور تھے مثلاً ایک قصہ یہ سننے میں آیا کہ

اجمیر شریف کے عرس میں اُنکی جیب میں سے دو سَو روپئے کہیں گر گئے۔ سخت پریشان تھے۔ کہ اُن کے ایک دوست مل گئے۔ اُنھوں نے پوچھا۔ کہاں جارہے ہو؟" آغا صاحب نے کہا" دلّی جاؤں گا" بولے "یہ دو سَو روپے میرے گھر دیدینا" آغا صاحب نے روپے لے لئے اور بغیر ٹکٹ ہی ریل میں سوار ہو گئے۔ ریل فرّاٹے بھر رہی تھی کہ ایک ہاتھ کھڑکی میں سے اندر آیا۔ اس میں آغا صاحب کا بٹوہ تھا، آغا صاحب نے بٹوہ لے لیا۔ اور کھول کر دیکھا! اسمیں دو سَو روپے بھی موجود تھے اور ٹکٹ بھی) جب دوست کے گھر جاکر کُنڈی بجائی تو وہی دوست خود گھر میں سے نکلے چلے آئے۔ آغا صاحب نے حیران ہو کر پوچھا" آپ؟ آپ تو اجمیر میں تھے!" انہوں نے کہا میں تو یہیں ہوں، اجمیر کیسا؟" آغا صاحب نے کہا: آپ وہاں مجھے بازار میں ملے۔ یہ دو سَو روپے آپنے مجھے اپنے گھر پہنچانے کے لئے دیئے" دوست نے تعجب سے اُنکی طرف دیکھا کہ آغا صاحب کسی اور عالم میں تو نہیں ہیں مگر وہاں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، کہا" آپ کو دھوکہ ہوا، نہ تو میں اجمیر گیا، نہ میں نے آپ کو روپے دیئے۔" آغا صاحب نے جب جوگ لے لیا تھا تو اُس زمانے میں بھی کچھ غیر معمولی باتیں اُن سے ظہور میں آنے لگی تھیں، اور شاید انہیں سے گھبرا کر آغا صاحب نے جوگ کو تج دیا تھا کہ، ہاں تو کہنا یہ تھا کہ بُرے وقت میں غیب ہی سے آغا صاحب کی امداد ہوتی تھی، کسی بندے بشر کا ہباؤ نہیں پڑتا تھا کہ اُنہیں کچھ دے۔

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

آغا صاحب کا آخری وقت دلّی میں اپنے گھر ہی پر گذرا، اور ایک دن سُنا کہ آغا صاحب قیدِ حیات سے چھوٹ گئے۔ اچھے آدمی تھے۔ اچھی گذار گئے، جانا بھی کو ہے ع

آج وہ کل ہماری باری ہے

بڑی حق ناشناسی ہوگی اگر بیگم آغا کا ذکر نہ کیا جائے، ایسی صابر و شاکر خاتون کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں، آغا صاحب کی زندگی جس شکل سے گزری اُسکی ایک جھلک آپ نے دیکھ لی۔ بیگم آغا ہی نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کچھ اس سلیقے سے کی کہ آج بفضلہ تینوں لڑکے برسرِ روزگار اور خوش حال ہیں، سب سے چھوٹی لڑکی اپنے گھر بار کی ہے۔ شعر گوئی ورثے میں سب کو ملی ہے مگر سب سے زیادہ اس بچی کو جو سحاب تخلص کرتی ہے، اپنے نامی گرامی باپ کی طرح نثر بھی خوب لکھتی ہے۔ ماشاءاللہ۔

ان چاروں بھائی بہنوں سے مل کر جی خوش ہو جاتا ہے، دلّی کا روایتی حسنِ اخلاق بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ، خوش خو، خوش کلام، خوش صفات، یہ عطیہ ہے بیگم آغا کا۔

آغا سرخوش منجھلے صاحبزادے ہیں۔ شعر خوب کہتے ہیں، مگر سناتے نہیں، اور نمود سے گھبراتے ہیں، رسالہ چمنستان دلّی سے نکالا تھا جو کئی سال تک چلتا رہا، کراچی آکر بھی اسے جاری رکھا مگر ناہموار حالات کی بادِ سموم میں ادب کا یہ چمن اجڑ گیا، آغا صاحب کی دو چار کتابیں بھی چھپ چکی ہیں، اب انہوں نے ایک مجموعۂ مضامین مرتّب کیا ہے، جس میں تمام وہ مضامین جمع کیے ہیں جو آغا صاحب پر لکھے گئے۔ لکھے تو اس سے بھی کہیں زیادہ گئے ہیں مگر جتنے انہوں نے یکجا کر لئے، یہ بھی بہت قابلِ قدر ہیں، زمانہ زُود فراموش اور بڑا ناگنا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے آغا صاحب کی ایک یادگار تو قائم رہ سکے گی۔ ان کی سعادت مندی سے توقع بھی یہی تھی،

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

مجھ سے سرخوش صاحب نے اس بیش بہا مجموعے پر پیش لفظ لکھنے کی

نمائش کی۔ میں اس پیشکش کے لیے اپنے آپ کو مفتخر محسوس کرتا ہوں! میں نے آغا صاحب پر کچھ لکھا بھی نہیں تھا۔ لگے ہاتھوں میں اس فرض سے بھی ادا ہو گیا۔

بلکہ ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
البتہ لہو لگا کر شہیدوں میں شریک ہو گیا۔

ہمدرد صحت کراچی
اپریل ۱۹۶۶ء

فخرِ دہلی

آرزو لکھنوی

موجودہ زمانہ یا آئندہ دور کبھی تو اپنے نقصان کی تلافی کر لیتا ہے۔ اور کبھی وہ نقصان دنیا کے لئے نقشِ عبرت بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی نقصان ادبی دنیا کو فخرِ دہلی آغا شاعر قزلباش کی بے وقت موت سے پہنچا ہے۔ جس کی تلافی ممکن نہیں۔

موصوف حضرت داغ کے اُن تلامذہ میں سے تھے۔ جو بجا طور پر اپنے اُستاد کے قائم مقام سمجھے جاتے تھے۔ یوں تو ہندوستان کے وسیع رقبے کے بڑے بڑے شہروں میں حضرت داغ کے تلامذہ پھیلے ہوئے تھے اور اب بھی موجود ہیں مگر اہل زبان ہونے کا شرف جن کو حاصل تھا۔ وہ صرف اہلِ دہلی ہی تھے،

موجودہ زمانے میں جناب جلیل، جناب بیخود، جناب آغا شاعر مرحوم کو اپنی اپنی جگہ وہی اعتبارِ سخن حاصل تھا، جو اب سے پہلے حضرت ذوق، حضرت مومن اور حضرت غالب کو حاصل تھا۔ افسوس کہ ان تین بزرگانِ فن میں سے ایک ایسی ہستی کو موت نے چھین لیا، جس کی خالی جگہ پُر نہیں ہو سکتی۔ مرحوم اپنے رنگ کے ایک ہی شاعر اور اسم بامسمیٰ تھے۔ برسوں ان کے لئے آنکھیں روئیں گی اور دل تڑپے گا، کیونکہ اس نقصان کی تلافی کے آثار و اسباب مفقود نظر آتے ہیں۔

ماحول بدل گیا۔ ماضی حال نہیں بن سکتا کہ اپنی تربیت میں کسی نوجوان کو

ترقی کرنے کا موقع دے، ترقی اب بھی ہوگی، مگر موجودہ ماحول کے زیر اثر، جو اُن محاسن سے خالی ہے، جس کے لئے آنکھیں اشکبار ہیں اور دل دردمند۔

آغا شاعر مرحوم صرف غزل ہی کے بلند پایہ شاعر نہ تھے بلکہ آپ ہر صنفِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے، افسوس کہ اس مسافرت میں ہم بالکل تہی دست ہیں اور ہمارے پاس مرحوم کے کلام کا کوئی حصّہ موجود نہیں ورنہ اُن کے جواہر پاروں کے وہ نمونے پیش کرتے جو ہمیشہ پڑھے جانے پر قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔

چمنستان مارچ ۱۹۴۸ء

دلدار شاہ داتا

آغا آفتاب قزلباش

یہ ملی گنج ہے، یہاں دلدار شاہ داتا کی قبر ہے، جو بڑے بڑے سُرخ قرمزی اور گہرے زرد گلاب کے پھولوں سے مہک رہی ہے، دلدار شاہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرام کر رہے ہیں، ان کے متعلق عام شہرت ہے کہ یہ بڑے نفیس مزاج اور حسین و جمیل بزرگ تھے ہمہ وقت پاک صاف اور عطر سے اپنے کو بسائے رکھتے تھے، آج ان کی قبر گلاب کے پھولوں سے مہک رہی ہے، اور وہ خود منوں خاک کے نیچے پڑے آرام سے سو رہے ہیں۔

میرے آنسو نکل پڑے، اللہ اکبر، اتنا نازک مزاج آدمی جسے گرد و غبار تو کجا، سگرٹ کے دھوئیں سے بھی تکلیف ہوتی ہو، جس نے طلوع و غروب کے مناظر کی کھلے بندوں سیر کی ہو، جو ساری زندگی ہوا کی طرح آزاد اور پانی کی طرح رواں دواں رہا ہو، آج قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری میں آسودہ ہے،

دلدار شاہ غزل کے بادشاہ تھے اور معروف شاعر، انہیں کا یہ شعر میں نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے پڑھا ؎

لحد میں اُن کے جسمِ نازنیں پر کیا گذرتی ہے
سحر تک جن کو بے چینی رہی ہو اچینِ بستر کی

مارچ ۱۹۵۶ء کا بارھواں دن طلوع ہوا، مطلع صاف تھا، نہ بہت زیادہ گرمی تھی نہ بارش کے کوئی آثار، عصر اور مغرب کے درمیان ایکا ایکی آندھی کے جھکڑ

چلنے لگے، گرد و غبار سے آسمان تاریک ہو گیا۔ بڑے بڑے تناور درخت چرچرا کر بڑے دھماکوں سے زمین پر آ رہے، رستے ویران ہو گئے، ٹریفک رک گیا، بجلی کے تار ٹوٹ گئے، مکانوں سے ٹین کے سائبان اُتر گئے، الاماں و الحفیظ، طوفان کے ساتھ ہی بارانِ رحمت کا نزول شروع ہوا، بارش کہتی تھی کہ اب برس کے کھلنے کا نام نہ لوں گی، تل دھار اوپر دھار ایسی طوفانی شام کو دلدار شاہ کی طلبی کا حکم آیا۔ یہ راضی بہ رضا کلمہ پڑھتے ہوئے، ہلکی مسکراہٹ چہرے پہ لئے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ دنیا سے سدھار گئے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ لوگوں میں ذکر ہوا کہ دلدار شاہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے، دیکھا نہیں کیسا سخت طوفان اور کس غضب کی بارش تھی، کوئی بزرگ جب دنیا سے اٹھتا ہے تو طوفانی عناصر کا اسی قسم کا مظاہرہ ہوتا ہے، دوسری صبح ایک مقامی روزنامے نے لکھا، دلی کا زباندان، ہندو مسلم اتحاد کا سچا عاشق چل بسا، دوسرے اخبار نے لکھا ع اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟ کسی نے کچھ لکھا، کسی نے کچھ، حضرت شمس العلما خواجہ حسن نظامی دہلوی نے منادی میں لکھا، "یہ کم آدمیوں کو معلوم ہو گا کہ دلدار شاہ ایک زمانے میں سلطان جی آ کر رہے تھے، میں نے انہیں ایک کمرہ دیا تھا اور وہ کمرہ بند کر کے عبادت کیا کرتے تھے"۔ مجھے دلدار شاہ کے ملفوظات میں کچھ اور دلچسپ واقعات ملے۔

دلدار شاہ ایک صاف دل اور پاک باطن معصوم آدمی تھے، ایک زمانے میں گیروے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنا کرتے تھے، بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے نور کی شعاعیں نکلتی تھیں، سورت اور احمد آباد بھی کچھ دن قیام کیا تھا اور وہاں کے

لوگ انہیں دلدار شاہ داتا کے لقب سے یاد کرتے تھے، ان کے ایک سوزنی دوست نے بیان کیا کہ دلدار شاہ الا اللہ کا ورد کیا کرتے تھے، ایک برگد کا درخت جس نے اپنے پھیلاؤ میں اپنی داڑھیوں سے گھپائیں بنا دی تھیں، اس کے نیچے دلدار شاہ اپنے چند معتقدین کے ہمراہ بیٹھے ذکر فکر کی باتیں کر رہے تھے، دلدار شاہ بتا رہے تھے کہ اللہ کے کلام میں بڑی قدرت ہے، یہ پہاڑوں کو بادل کی طرح اڑا سکتا ہے، درختوں کو پرِکاہ کی طرح پھینک سکتا ہے، مگر اس کا وِرد کرنا اور مشق کرنی ہی تو مشکل ہے، یہ کہہ کر آپ دو زانو ہو کر بیٹھے اور زور سے الا اللہ کا نعرہ مارا، معناً برگد کا ایک بہت بڑا ٹہنا جڑ سے اپنی جگہ سے علیحدہ ہو کر دھم سے زمین پر آ رہا، اتنے پرانے تناور درخت کے ٹہنے کے گرتے ہی لوگ دیوانہ وار دلدار شاہ کے حضور میں جمع ہونے لگے، آپ کی یہ کرامت شہر بھر میں آگ کی طرح پھیل گئی، دلدار شاہ ایسی چیزوں سے گھبراتے تھے چنانچہ راتوں رات سولت سے غائب ہو گئے۔

سلطان جی اور حضرت خواجہ اجمیری سے بڑی عقیدت تھی، اجمیر شریف میں دلدار شاہ بیمار ہو گئے، جو نقد روپے پاس تھے وہ ایک رومال میں بندھے ہوئے تھے، گھبرا کر دتی کا قصد کیا، اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ رومال کہیں گر گیا ہے، آپ وہاں سے درگاہ پہنچے، عرض کی کہ مجھے دتی جانا ہے اور میرا رومال جس میں روپے تھے کہیں گر گیا ہے، میرے پاس اب زادِ راہ بھی نہیں ہے، باہر نکلے ہی تھے کہ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں دہلوی رئیس لوہارو سے ملاقات ہوئی، انہوں نے کہا، آپ دتی کب جا رہے ہیں، دلدار شاہ نے کہا آج اور ابھی، نواب صاحب نے کہا میری خاطر اتنی تکلیف گوارا کیجئے کہ یہ ڈیڑھ سو روپے میرے گھر پہونچا دیجئے۔

میں بھول آیا ہے۔ وہاں ضرورت ہوگی، دلدار شاہ نے روپے لے لئے اور گاڑی میں سوار ہوگئے۔ گاڑی نے پوری رفتار پکڑلی تھی کہ کھڑکی سے ایک ہاتھ بلند ہوا جس میں دلدار شاہ کا وہی رومال تھا جس میں ان کے روپے تھے، آواز آئی یہ رومال گر گیا تھا لے لیجئے، دلدار شاہ نے رومال لے لیا اور کھڑکی سے جھانک کر رومال دینے والے کو دیکھا، مگر وہاں پہاڑ ہی پتھروں اور بھاگتے ہوئے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔

دتی پہنچ کر دلدار شاہ نواب شجاع الدین صاحب کے دولت کدے پر تشریف لے گئے، اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو نوکر نے آکر کہا! نواب صاحب ایک ہفتے سے فریش ہیں، آپ کو اندر ہی بلوایا ہے، دلدار شاہ اندر پہنچے تو نواب صاحب کو نہایت کرب میں پایا، کچھ پڑھتے رہے اور دم کرتے رہے، چلتے ہوئے نواب صاحب کو اجمیر والا وقوعہ سنایا، نواب صاحب نے کہا "بھائی، میں تو ایک ہفتے سے بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکتا ہوں اجمیر جاتا تو کیسے جاتا"

دلدار شاہ کی شاعری کی دھوم تھی، ان کی غزل خوانی بھی بے نظیر تھی، تحت اللفظ پڑھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ شاعر کیسے بنے؟ دلدار شاہ صاحب سیف خاندان سے تھے، وہ نسلی طور پر قزلباش تھے ان کے گھرانے میں علم و فضل کی دستار اُس وقت بندھتی تھی جب وہ اچھا خاصا تلوریا تسلیم کر لیا جاتا، دلدار شاہ کو ۱۲ سال کی عمر میں گھر سے نکال دیا گیا تھا، یہ بے ماں کا بے زبان بچہ دو دن مسلسل فاقے اور دربدری سے تنگ آکر حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کے مزار پر آبیٹھا، گرمی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں

شاہ کلیم اللہ کے مزار پر سوائے اس معصوم بچے کے کوئی اور نہ تھا، ناز ونعم کے پلے ہوئے بچے نے دو دن کی فاقہ زدگی سے چُور ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، کھانے کی دکانوں کے پاس سے گذرتے ہوئے بچے نے بڑی حسرت سے کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تھا مگر واہ رے غیرت کسی کے سامنے مُنہ سے نہ نکلا کہ میں دو دن کا بھوکا ہوں،

شاہ صاحب کے مزار پر لیٹے لیٹے بچے کو نیند آگئی مگر تھوڑی دیر میں کھانے کی خوشبو سے آنکھ کھل گئی، اب جو اٹھ کر دیکھا تو زردے کی گرما گرم چڑی دار پلیٹ سامنے رکھی ہے، بچے نے ادھر اُدھر دیکھا چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کہیں دُور دُور آدمی کا پتہ نہیں تھا، کسی کے آنے جانے کا سان گمان بھی نہ تھا، بھوک سے بے تاب ہو کر زردے کی ساری پلیٹ کھالی اور پانی پیا، دلدار شاہ کو کھانا کھاتے ہی ایک قسم کا سُرور پیدا ہوا اور وہ عالم طاری ہو گیا جس وقت آدمی کچھ کہتا ہے جو اس پر نازل ہو رہا ہو، دلدار شاہ مترنم ہوئے اور پہلا شعر اس وقت کہا جب ہر گز ہر گز سن تمیز و شعور نے انہیں چھوا تک نہیں تھا،

دلدار شاہ بڑے نیک دل اور دوسروں کے کام آنے والے داتا تھے۔ چھپ کر اور چھپا کر وہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتے تھے، اور حضرت علیؑ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ "جب سائل کو کچھ دو تو اس کی جانب نہ دیکھو کیونکہ اس کے چہرے کی کیفیات تم دیکھو گے تو وہ شرمندہ ہوگا، اس طرح دو کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے ہاتھ کو نہ ہو" ان کے ایک ہندو عقیدت مند جوڑے کے ہاں کئی سال سے اولاد نہ ہوئی تھی، دلدار شاہ کے تعویز لکھنے کی بات اڑتی اڑتی ان لوگوں نے بھی سن

لی، ان ہندو دوست نے دلدار شاہ سے عرض کیا۔ دلدار شاہ کچے سوت کے دھاگوں کو پڑھ دیا کرتے تھے، اور کوئی تعویز بھی بازو پر باندھنے کو دیتے تھے۔ مگر ہمیشہ پیچھا چھڑاتے تھے، عاجزی اور انکساری سے ٹالتے پھر بھی اگر کوئی مصر ہو جاتا اور اللہ کا حکم بھی شاملِ حال ہو جاتا تو وہ تعویز بھی لکھ دیتے تھے، اور کلامِ خدا کی برکت سے لوگوں کی مراد بھی پوری ہو جاتی تھی، چنانچہ دلدار شاہ تعویز دے کر کوچ کر گئے، ان ہندو عقیدت مند کو بڑی مایوسی ہوئی، لیکن عین مایوسی میں انہوں نے دلدار شاہ کو خواب میں دیکھا، دلدار شاہ مسکرائے اور ایک بڑا سیب ان کو دیا اور کہا گھبراؤ نہیں، اللہ میں بڑی قدرت ہے۔ آج بھی وہ صاحب دلدار شاہ کے عقیدت مند ہیں اور اپنا ہرا بھرا باغ دیکھ کر مسکرایا کرتے ہیں۔ جس کو دلدار شاہ نے برکت دی تھی۔

وصال سے چند گھنٹے پہلے دلدار شاہ نے کہا تھا کہ ایک آدمی بڑا لمبا چوڑا میرے لئے سونے کی جگمگاتی ہوئی کرسی لایا ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ اس میں بیٹھو میں سمندروں، پہاڑوں اور دریاؤں سے اُڑا کر لے جاؤں گا۔ مگر میرا دل لرز رہا ہے، پھر فرمایا میرے اوپر سے ہوائی جہاز گذریں گے۔

اللہ اللہ وہ سونے کی کرسی پر بیٹھ کر سمندروں، دریاؤں اور پہاڑوں سے گذر کر کسی نامعلوم جگہ چلے گئے، لیکن جہاں ان کا جسدِ خاکی مدفون ہے اس پر سے ہوائی جہاز اُڑ کر دن رات نہ جانے کتنی بار گذرتے ہیں، ابھی ابھی سبز، سُرخ روشنی دکھاتا ایک امریکن جہاز گذرا ہے، مجھے دلدار شاہ کی معصوم باتیں رُلا رہی ہیں، روز آسمان میں تارے رقص کرتے ہیں، روز ہوا میں سرسراتی

ہیں۔ صبح طلوع ہوتی ہے۔ شبنم برستی ہے۔ دوپہر ہوتی ہے پھر شام ہو جاتی ہے، لیکن اب دلدار شاہ کو کسی موسم سے تکلیف نہیں ہوتی، اور وہ گہری نیند سو رہے ہیں؛ ان کی قبر پر جو کتبہ لگاہے اس میں ایک یہ بھی مصرعہ ہے۔ ع

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

آجکل دلی - ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء

حضرت آغا شاعرؔ

اثرؔ جلیلی

جدید تحقیقات انسان میں عناصر اربعہ کے امتزاج کو باطل کہتی رہی، لیکن انسانی مزاج سے آگ کا احتراق، پانی کی روانی، باد کی آزاد روی، اور خاک کی چستی جدا نہیں کئے جا سکتے، اور جب تک ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا اردو شاعری آغا شاعر مرحوم کے ایسے اشعار نہیں بھلا سکتی کہ ؎

دنبالۂ اُن کی تند نگاہی میں آگیا
کھینچ کر کماں سے تیر۔ گواہی میں آگیا

اُف، اُف، وہ اُچٹتی سی نگاہ غلط انداز
اس طرح سے دیکھا ہے کہ گویا نہیں دیکھا

یہ تم کہتے ہو؟ دشمن بے باوفا ہے؟ اگر تم مانو
زمیں پر آسماں ہونے کا ہیں کیونکر گماں کروں!

کسی کے رد کئے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے
بہار آئی، چلا میں، یہ دھری ہیں بیڑیاں میری

تم نہ سمجھے تھے کہ مایوسیاں کیا کرتی ہیں
ہم نہ کہتے تھے کہ بیمار گھڑی بھر میں نہیں

ہم نشیں مستی چشم بت مخمور نہ پوچھ
ٹھیر، دم لے، سنبھل آنے دے ذرا ہوش مجھے

ہر سو ترقی پسندی کا آوازہ بلند ہے، تنقید کے نئے نئے زاویے پیدا ہو رہے ہیں انقلاب کے فلک شگاف نعروں سے بزم ادب گونج رہی ہے، لیکن یہ شعر اب بھی دل میں پیوست ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ؎

یہ کیسے بال کھولے آئے، کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

گو میں ادب کے افادی پہلو کا منکر نہیں، لیکن کسی چیز کا اپنی حد سے متجاوز ہو جانا اس کی معیوبیت ہو جانے کی بیّن دلیل ہے، چاہے وہ ادب کی افادیت ہو یا عدم افادیت افراط بہر صورت مضر ہے۔ اور فی زمانہ ہمارا ادبی مذاق ایسی ہی افراط و تفریط کی وادیوں میں سرگرداں ہے، مجھے یقین ہے کہ عبوری یا بحرانی دور جب ختم ہو جائے گا تو ہم پھر ایک مرتبہ اپنے اس ادبی سرمائے کا جائزہ لینے پر مجبور ہونگے جسے اس وقت قدیم اور فرسودہ کہہ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس لیے اس کا تو کوئی اندیشہ ہی نہیں کہ متقدمین کی کاوشیں بھلا دی جائیں گی، کیونکہ جب تک انسان انسان ہی سے محبت کر سکتا ہے، چاہے اس کی بنیاد جنسی میلان پر ہو یا ہمدردی پر، شعر فنا نہیں ہو سکتا۔

آدمی، آدمی سے ملتا ہے
بات کرنی تو کچھ گناہ نہیں

اور جب تک حسن میں آرائشِ جمال کا ذوق باقی ہے اور عشوہ طرازی اس کی فطرت سے جدا نہیں کی جا سکتی یہ شعر بھی نہیں مٹایا جا سکتا۔

ناز سے فرصت کہاں اُس نرگسِ خود کام کو
بادہ پیمائی گراں ہوتی نہیں ہے جام کو

اور جب تک یہ اشعار نہیں بھلائے جا سکتے، آغا شاعر مرحوم بھی نہیں بھلائے جا سکتے، یہ اور بات ہے کہ کسی وقتی تحریک کے ماتحت اُن کی یاد کی شدت میں کمی ہو جائے

آغا شاعر مرحوم داغ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، اس لئے آپ کی شاعری سے متعلق نیاز صاحب کی یہ رائے نہایت صائب ہے کہ "شاعری میں انہوں نے وہ سب لکھا جو داغ کے ایک ممتاز شاگرد کو لکھنا چاہیے تھا، داغ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے

منفرد ہیں۔ اُنہوں نے اردو غزل کے مزاج میں اتنی تبدیلی کی جتنی کہ امکان میں تھی، داغ سے قبل اردو غزل میں عاشق کی طرف سے صرف سپردگی کے جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لیکن داغ نے اسے متروک قرار دے کر خودداری کے جذبات کو رواج دیا۔ وہ آدابِ محبت کو ٹھکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ان کا مزاج تھا اس لئے ان کی خصوصیت قرار پا گیا، اس باب میں کوئی اُن کا شریک و سہیم نہیں، لیکن اس کے علاوہ جس قدر خصائص داغ کا طرۂ امتیاز ہیں وہ بدرجہ اتم آغا شاعر میں موجود ہیں، مثلاً داغ ہم وزن جملوں سے مصرعے اور بعض اوقات پورا شعر موزوں کر لیتے تھے مثلاً

تری اُلفت کی چنگاری نے ظالم، اک جہاں پھونکا
ادھر چمکی، اُدھر سُلگی، یہاں بھوڑکا، وہاں پھونکا

ایسے شعر حضرت شاعر کے ہاں بھی نظر آتے ہیں مثلاً

گری، گر کر اُٹھی، پلٹی، تو جو کچھ تھا اٹھا لائی
نظر کیا کیمیا تھی، رنگ چہروں سے اُڑا لائی

اس کی چٹکی سے چھٹا، سینے میں اُترا، دل میں تھا
کیا ٹھکانا توڑ کا، پلٹے تو دیکھو تیر کے

یا محض کسی ایک لفظ یا محاورے کو مضمون کی بنیاد قرار دے کر شعر بنا دینا مثلاً

تبسم زیرِ لب، رُخ پر لٹیں ہیں	یہ لٹ دہاری بنے آئے کہاں سے
شاعرِ نازک طبیعت ہوں مرا دل کٹ گیا	ساقیا لینا، کہ شائد بال پیمانے میں تھا

آغا شاعر کے پورے کلام میں داغ کے گہرے اثرات نمایاں ہیں، داغ کا تتبع یقیناً مشکل ہے، یہ اور بات ہے کہ کسی جذبے سے مغلوب ہو کر داغ کی تنقید کی جائے یا

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مثال میں اس کے ۔ کمزور اشعار کو پیش کیا جائے لیکن آغا شاعر کو دتی کی زبان پر جو قدرت حاصل تھی ۔ وہ یقیناً اس باب میں ان کی ممد و معاون ثابت ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے استاد کے صحیح متتبع نظر آئے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ مولانا عبدالسلام نے اپنی تصنیف "شعر الہند" میں تلامذۂ داغؔ کے تذکرے کے ضمن میں آغا شاعرؔ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مصنف کو آغا شاعرؔ سے کوئی ذاتی پرخاش تھی۔ کیونکہ آپ ایسے صحیح الانسان سے کسی کو ذاتی عناد ہونا متبادر نہیں ہو سکتا، لیکن اس فرو گذاشت کو مولانا کی لاعلمی پر محمول کرنا یقیناً اُن کے علم کی تنقیص کرنا ہے ، گو یہ صحیح ہے کہ مولانا اکثر اپنے منصب سے ہٹ گئے ہیں جس کی وجہ سے ایسی گراں قدر تصنیف کی منزلت مجروح ہو گئی ہے لیکن ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمہ آفتاب را چہ گناہ؟

آغا شاعرؔ نہ صرف اس اعتبار سے نہیں بھلائے جا سکتے کہ وہ داغؔ کے صحیح شاگرد ہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے کہ انہوں نے تا حین حیات ہر طرح اردو کی خدمت کی۔ جس شاعر نے رباعیات خیام کا ترجمہ اس قوت سے کیا ہو کہ اس پر اصل کا گمان ہونے لگے ۔ متعدد ناول ، ڈرامے اور مضامین لکھے ہوں ۔ قرآن شریف کا مکمل منظوم ترجمہ کیا ہو ، اس کی کاوشوں کو نہ سراہنا بلکہ موقع پر اس کا ذکر بھی نہ کرنا یقیناً "ادبی ثقاہت کے منافی ہے ۔

آغا شاعرؔ کا صحیح منصب غزل گوئی ہے ، گو یکھنے کو جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ انہوں نے ، ناول ، ڈرامے ، قصیدہ ، رباعی ، مرثیہ ، منظوم ترجمہ ، رباعیات

خمخانہ، منظوم ترجمہ کلام اللہ، سب ہی کچھ لکھا اور یہ سارا سرمایہ اُن کی حیرت ناک قدرتِ بیان کی بیّن دلیل ہے۔ دلی کی صاف سادہ اور نتھری ستھری زبان، داغ کا اتباع اور اُن کی اصلاح، اردو غزل کے مزاج سے کس قدر مناسب رکھتے ہیں۔ اسے کون نہیں جانتا، اور یہی حضرت شاعر کا بھی طرۂ امتیاز ہے،

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے، جان بیکل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی، خبر ہے اپنے عالم کی

بُرے حال سے بابھلے حال سے
تمہیں کیا، ہماری بسر ہو گئی

کبھی تم نے سُنا دردِ محبت؟
کبھی ہم نے کہا اپنی زباں سے؟

پھر مرے سر کی قسم کھا کر چلے
پھر مجھے سرکار نے فقرا دیا؟

میرا اصرار، کہ اک شخص تمنائی ہے
اُن کا اٹھلا کے یہ کہنا، ہمیں نیند آئی ہے

کوستے ہیں ستانے والے کو
آپ سے تو کوئی خطاب نہیں

روز فرماتے ہیں، ہم چاہیں تو مٹ جاؤ ابھی
دیکھنا، کیا مری تقدیر بنے بیٹھے ہیں؟

ذرا اجازت تو لیجے سے رگا لوں رخسار
سینک لوں چوٹ جگر کی انہیں انگاروں پر

تم بھلا کون تھے، دل میں مرے آنے والے
دیکھنا، جان نہ پہچان، چلے آتے ہیں

دمِ آنکھوں میں اٹکا ہے، خدا کے لئے آؤ
پھر یہ نہ گلہ ہو، مرا رستا نہیں دیکھا

اسے نامہ بر بتا ہی دوں، ان کا اتا پتا ــــ آنکھیں ہرن سی، چاند سی صورت جواں ہیں

عہد باندھا ہے محبت کا بڑی مدت میں ــــ دیکھنا، توڑ نہ لینا، یہ ہری کونپل ہے

یہ آغا شاعر کا مستقل رنگ نہیں، کیونکہ اکثر وہ اس روش سے بہت آگے نکل جاتے ہیں، لیکن ان کے کلام میں بیشتر ایسے ہی اشعار ملیں گے جس میں بعض جگہ قدرے داغ کی شوخی آگئی ہے کچھ زبان کا چٹخارہ شامل ہو گیا ہے لیکن جب وہ استاد کے اتباع سے ہٹ کر کہتے ہیں تو پھر یہ کہتے ہیں:-

مجھ کو آتا ہے تیمم نہ وضو آتا ہے
سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

جو برق و باد پہ قادر، وہ اس قدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

زندگی اور موت میں اک عمر سے تھی کشمکش
وقت پر دو ہچکیوں نے پاک جھگڑا کر دیا

برقِ خرمن سوز، اب رکھنا ذرا چشم کرم
چار تنکے پھر جڑے ہیں، آشیانے کے لیے

رنج و خوشی، ہراس و تمنا سب ایک ہیں
چولے بدل رہا ہے یہ پتلا خیال کا

قدم بڑھائے ہوئے، آستیں چڑھائے ہوئے
بڑھے چلو، سر مقصد سے لو لگائے ہوئے

مٹتے، مٹتے بھی محبت کا نشاں رہتا ہے
بجھتے، بجھتے بھی سرِ شمع دھواں رہتا ہے

مسافرانِ عدم کس زمین پہ جاتے ہیں
کسی کا گور سے آگے پتا نہیں ملتا

روح کو تن سے نکلتے ہوئے موت آتی ہے
یہ وہ قیدی ہے اذیت جسے زنداں میں نہیں

ہستی ہے مری انجھنوں سے متشکّل
اس فکر میں رہتا ہوں کہ دھوکا تو نہیں ہیں

گو اس رنگ کے شعر بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن جتنے بھی ہیں، اپنی جگہ امتیازی درجے کے مالک ہیں، ان میں اردو غزل کے بدلتے ہوئے اسالیب کی جھلک بھی ہے اور نکھرتے ہوئے خیالات کا پرتو بھی۔ مثلاً

قدم بڑھائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

داغؔ اسکول کا رنگِ تغزل لیے ہوئے ہے اور داغؔ یا داغ کے تلامذہ سے یہ توقع کرنا کہ وہ حسن و عشق کے دائرے سے نکل کر اس کے لیے مصرعہ ثانی تلاش کریں گے. غلط ہے، کیونکہ فانیؔ جیسا شاعر جو اپنا رنگ کہیں نہیں چھوڑتا جو اس کی پختگی اور قدرت کا ثبوت ہے. اس قافیے میں یہ شعر کہنے پہ مجبور ہو گیا کہ ؎

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا
نظر بچائے ہوئے، آستیں چڑھائے ہوئے

لیکن آغا شاعر اس دائرے سے نکل جاتے ہیں، اور بجائے محبوب کے

ذکر کے یہ مصرعہ لاتے ہیں۔

بڑھے چلو سرِ مقصد سے لَو لگائے ہوئے

اسی طرح یہ شعر بھی داغؔ اسکول سے مناسبت نہیں رکھتا کہ۔

داور رو نہ جدا، اب تو بہت رات آگئی
کل پھر اک محشر رہے میرے فسانے کے لئے

مصرعِ اولی میں جو یاس کی آمیزش ہے وہ میرؔ کی یاد دلاتی ہے، داغؔ کی نہیں لیکن ایسے شعر آپ کے ہاں کم ہیں، اس کی یہ وجہ نہیں کہ آپ ایسے شعر کہہ نہ سکے۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ آپ جس دور کے شاعر ہیں اس دور میں تغزل میں داغؔ کا رنگ مطبوعِ خاص و عام تھا اور بیشتر غزل گو حضرت داغؔ کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے تھے، مثلاً امیرؔ مینائی جیسی ہستی کو داغؔ کے رنگ میں غزل کہنی پڑی، اس لئے اگر آغا شاعرؔ کے ہاں اسی رنگِ تغزل کی بہتات ہے تو ہم اس پر معترض نہیں ہو سکتے، لیکن جہاں وہ اس رنگ سے ہٹ کر کسی دوسری روش پر چل نکلتے ہیں اُن کی اس مساعی کو داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہے۔

آج کی غزل کل کی غزل سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ لیکن یہ تبدیلی کوئی فوری انقلاب نہیں کہ جس نے یک بیک یہ تغیر کر دیا بلکہ اس میں بھی وہی بتدریج بہاؤ نظر آتا ہے جو ہر انقلاب کا پس منظر ہوتا ہے، اور اس بہاؤ کے راستے میں جو رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں یا موجود تھیں ان کو دور کرنے اور بہاؤ میں قوت پیدا کرنے میں ہمارے ان قدیم رنگِ سخن کے علمبرداروں کا کس قدر حصّہ ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کی ادبی کوششوں

کو شخصی تعصب اور ذاتی میلان کی سطح سے بلند ہو کر دیکھا جائے، لیکن افسوس ہے کہ ہماری تنقید ابھی "تنقیص" اور "توصیف" کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہے۔

جوش ملیح آبادی نے اچھا کہا ہے کہ "آغا صاحب کی زبان میں وہ شیرینی ہے، جیسے لعلِ شکار، وہ لوچ ہے جیسے شاخِ گل، اور وہ روانی ہے جیسے آبِ رکنا باد" لیکن میں آپ کے کلام کے مطالعہ کے بعد جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے واضح کر چکا ہوں جس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ یہ اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی شاعری میں قدیم و جدید اسلوب کا وہ امتزاج ہے جیسے گنگ و جمن کا سنگم۔

(از چمنستان مارچ ۱۹۴۷ء)

جہانِ اُستاد

گوپی ناتھ امن لکھنوی

بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا، میں ابھی اسکول میں داخل نہ ہوا تھا کہ لکھنؤ میں یہ غزل عام طور پر گائی جانے لگی۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

غوث نگر میں رہتا تھا، مکان ایسی جگہ تھا کہ امین آباد سے نخاس جانے والی سڑک دکھائی دیتی تھی، تانگے تو اس زمانے تک لکھنؤ میں عام نہ ہوئے تھے، البتہ یکے بہت چلتے تھے، ان پر سے اکثر اس غزل کے دو ایک شعر سننے میں آجاتے تھے۔ یاد نہیں کہ میں نے دادا صاحب مرحوم یا والدِ مغفور سے دریافت کیا کہ یہ غزل کس کی ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ داغ کی معلوم ہوتی ہے، بالکل وہی زبان ہے، بہت دنوں تک میں اسے داغ کی غزل سمجھتا رہا، مدتوں بعد معلوم ہوا کہ حضرت آغا شاعر کی غزل ہے، اور حضرت آغا شاعر کے درشن تو ۱۹۳۰ء میں نصیب ہوئے۔ جب تیج اخبار کی طرف سے یوپی اور دہلی کے کہنہ مشق شاعروں کو پارٹی دی گئی تھی، یہ نہ معلوم تھا کہ یہ استادِ فن دنیا میں صرف چھ سال کا مہمان ہے۔

داغ کی دہلی میں دھوم تھی، پنجاب میں حالی، آزاد اور آشوب اردو کو وسعت دینے کے کام میں لگے تھے۔ غالب کی رحلت ہو چکی تھی، لکھنؤ میں امیر مینائی کا دور دورہ تھا، اسی زمانہ میں ۱۸۷۱ء میں آغا شاعر کا جنم ہوا۔ دادا کے

زمانے تک بقول غالب پیشہ آبا سپہ گری رہا۔ والدِ ماجد اورسیئر تھے۔ آغا شاعر نے نہ تلوار سنبھالی نہ سرکاری ملازمت کی طرف رُخ کیا۔ تلوار کی جگہ قلم ہاتھ میں لیا، سرکاری ملازمت کی جگہ خدمتِ ادب اختیار کی۔ قدرت نے انہیں اسی لئے بنایا تھا۔

ہر یکے را بہرِ کارے ساختند   میل آں در طبع او پرداختند

ابھی عمر برسوں کا شمار اکائیوں میں تھا کہ شعر کہنے لگے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

ہوتے ہوتے وہ شہرت پائی کہ ہندوستان سے ایران تک مانے گئے، دربارِ ایران سے افسرالشعراء کا خطاب ملا، ہندوستان میں جہانِ استاد کہلائے۔ داغ کے نورتن میں شمار ہوئے، جانشینئ داغ کے متعلق "خمخانۂ جاوید" میں یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"ہم اس موقعہ پر نہ حضرت داغ کی جانشینی کا مسئلہ چھیڑنا چاہتے ہیں۔ اور نہ دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ آغا شاعر کو اُستاد مانے، لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ طبع رواں کے جوہر، تغزل کی اصل شان، عاشق و معشوق کی گفتگو روزمرہ کے دلفریب اسلوب، اور بے تکلفانہ محاورات، جو داغ کی شاعری کا زبردست عنصر ہیں، آغا شاعر کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔"

داغ و حالی ظہیر و مجروح، طالب و ثاقب، راسخ و برتر، جیسے اُستاد اُن کے کلام پر پھڑک اٹھتے تھے، چنانچہ ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

بس مجھ کو داد مل گئی، محنت وصول ہے

سن لے غزل یہ بلبلِ ہندوستاں کہیں

پھر بھی ادبِ شاگردی ہمیشہ ملحوظ رہا، اور داغ کی رحلت پر فرماتے ہیں کہ

شاعر کسے دکھاؤں غزل، ہائے کیا کروں؟
میرے تو دل سے جا نہیں سکتا ہے داغ داغ

خود حضرت داغ انہیں کیا سمجھتے تھے۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے بہت سے شاگردوں کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی غزلیں آغا شاعر کو دکھا لیا کرو، اس زمرے میں سب سے ممتاز افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر برق نکلے، اکبر آلہ آبادی نے جب آغا شاعر کا یہ شعر پڑھا کہ

جو برق و باد پہ قادر، وہ اس قدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

تو اپنے ایک دوست کو لکھا بھئی مولانا میں تو ضعف و نقاہت کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے مجبور ہوں، اگر آپ آغا شاعر کی خدمت میں خط لکھیں تو میری یہ داد اُن تک ضرور پہنچا دیں کہ اُن کا ایک شعر میں نے آفتاب لاہور میں دیکھا ہے جو مجھے بے حد پسند آیا فی الواقعی اللہ جل شانہ کے سطوت و جبروت اور طبائع انسان کی بیچارگی کے غوامض کو ظاہر کرنا انہیں جیسے فلسفی شاعر کا کام ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت آغا شاعر کا ذکر کس کس عنوان سے کروں، میرے نزدیک شاعر ہو یا مصور، ادیب ہو یا فلسفی، پہلے اس کا انسان ہونا ضروری ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آغا شاعر انسان تھے، اس لئے انہوں نے ایک دکھا ہوا دل پایا تھا اور ایک

بہتی ہوئی طبیعت، اللہ نے مجھے ایسی طبیعت دی تھی کہ جتنا بھی کمایا سب خرچ کر دیا۔ کچھ نہ بچا یا وہ بندۂ خدا تھے بندۂ زر نہیں۔ لیکن دنیا کا حال دیکھ کر جی ضرور کڑھتا تھا، چنانچہ لکھا ہے۔

زندگی خوب بسر ہوتی ہے زر ہونے سے ۔ فائدہ خاک نہیں، علم و ہنر ہونے سے

مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں، شاعر کو اپنے علم و ہنر سے فائدہ ہوا ہو یا نہیں دنیا کو تو فائدہ ہوا، سودا دو ہزار برس پہلے ہندوستان میں جا نکیہ کہہ گیا تھا کہ پاکیزگی کلام دوسروں کے لئے ہوتی ہے'

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی نے چند سال ہوئے حضرت آغا شاعر کے متعلق لکھا تھا، "آپ صرف ہماری قدیم شاعری ہی کا بہترین نمونہ نہیں بلکہ ہماری قدیم تہذیب و شرافت اور ہماری قدیم انسانی مزاج کے بھی علم بردار ہیں۔۔۔۔ آغا صاحب صرف اعلے درجے کے قدیم شاعر ہی نہیں، دنیا کے دلچسپ ترین انسانوں میں سے بھی ہیں۔۔۔ آپ کا لب ولہجہ، آواز کا زیر و بم، غم آمیز تبسم، چہرے کی مخلصانہ و معصومانہ تراش اور آپ کا شک آلود قہقہے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔۔۔۔ میں نے آج تک کسی مرد پیر کی باتوں میں آغا صاحب کا سا بھولپن نہیں دیکھا، جب وہ باتیں کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سفید بالوں کے پس پردہ کوئی بچہ رہا ہے"

اس سے بہتر الفاظ میں آغا شاعر کا کیرکٹر بیان نہیں کیا جا سکتا،

شاعر کی شاعری

آغا شاعر زبان کے دھنی تھے، انہیں اس پر ناز بھی تھا، اور بجا تھا۔

ہے یہی رنگ سخن تو شاعر شیریں بیاں ۔ تو بھی اک دن طوطی ہندوستان ہو جائے گا

وہ دیا کرتے کہ ہے شاعر یہ بالکل ٹھیک ہے

شعر کہتے کہتے میں اُستادِ کابل ہو گیا

شاعر خدا کی دی ہوئی عزت کسے نصیب!

لے اب تو دُور دُور ترا نام ہو گیا

پانچ ہی شعر قیامت کے لکھے ہیں شاعر

کیا تجھے میر کا اندازِ سخن یاد آیا

شاعر اب ایسے ایسوں کو ہے ادعائے فن

جن کی زباں درست نہ جن کا بیاں درست

اب غزل گو کوئی نہیں شاعر اس لیے تیرا بھی جواب نہیں

زباں داں بنے جاتے ہیں لوگ شاعر

ہم اک اک کی چتون نظر دیکھتے ہیں

شاگردوں کی کثرت کے متعلق فرماتے ہیں

کیونکہ اصلاح کریں، کیونکہ بنائیں شاعر

اب تو دیوان پہ دیوانِ چلے آتے ہیں

ٹھیک تو معلوم نہیں کہ انہوں نے حضرت داغ سے اصلاح لینی کب شروع کی، لیکن یقینی طور پر وہ زمانہ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان ہوگا۔ افسوس ہے کہ حضرت آغا شاعر کی غزلوں کا مجموعہ پُرانے طریقے پر ردیف وار ہی ملتا ہے، تاریخ وار نہیں ملتا، جس سے اُن کے کلام کے ارتقاء کا صحیح پتہ لگایا جا سکے، لیکن جو زبان انہوں نے لکھی ہے، اُسے جتنا سراہا جائے وہ تھوڑا ہے۔

اور محض سرلہنے پر ہی اکتفا نہ کرکے اس سے ایک بہت بڑے کام میں مدد لی جاسکتی ہے، آج ہندی اردو کے جھگڑے میں زبان ستیاناس ہو رہی ہے ہندی والے چن چن کر عربی فارسی کے وہ لفظ ہندی سے نکال رہے ہیں جو صدیوں استعمال ہوئے ہیں۔ اردو والوں کو نہ صرف سنکرت اور پراکرت بلکہ ہندی لفظوں کے بھی خارج کر دینے کی دھن ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا، سیاسی صورت اختیار کر گیا ہے ذرا دیکھو تو مرحوم نے کیا لکھا ہے۔

ہمارے ملک کی دیسی زبان اردو ہے اسی کا نام ہے ہندی، جنم کی ہندو ہے
یہ سب میں ایک ہے توحید کا بھی پہلو ہے جہاں بھر میں جو چلتا ہے یہ وہ جادو ہے

جہاز میں سنو اس کو چہاز پر سن لو
خدا جو چاہے تو پھر آسمان پر سن لو

اسی نظم کا آخری شعر ہے

ہزار کھیل کریں، گول سب اسی کے ہیں زبانیں لاکھ بنیں بول سب اسی کے ہیں

یہ بند نقل کر رہا ہوں اور میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں۔ ہائے ہم لوگوں نے ہندوستانی زبان کی تشکیل کے متعلق "آغا شاعر کی زندگی میں فائدہ کیوں نہ اٹھایا

آغا شاعر کی زبان ہر ایک کو نصیب نہیں، وہ مٹھاس، وہ بے ساختہ پن، وہ بے تکلفانہ محاورے انہیں کا حصہ تھے، ان کے کلام پر آتش کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگیں کے کم نہیں

ہندی کے الفاظ اور محاورے تو ایسے بولتے ہوئے ہیں کہ دل پھڑک اٹھتا

ہے۔ ردیف الف کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

لاکھ لاکھ احسان، جس نے درد پیدا کر دیا
جس نے اس دل کو ہتھیلی کا پھپھولا کر دیا

آنکھ دل کی شورشوں پہ جائے کیا — کر لی بھرتی ہے پھر اب پچھتائے کیا؟
سنبھالا نہ تم نے، اجل نے جلایا — کہیں کام رکتا ہے داتا کسی کا؟
مجھے کالورا کر دیا حسرتوں نے — کیا ہائے یہ عشق اچھا تمہارا؟

انداز بیان نے مجموعی باتوں میں بھی جادو پیدا کر دیا ہے، فرماتے ہیں،

اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہوگے؟ — پہلو میں ہمارے دلِ مضطر نہیں ملتا
اُتر کر بام سے اک بات سن لو — یہ کیا تم آسماں پر، میں زمیں پر

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا

کیوں نکھر گیا؟ ملا، نہ ملا، اُس نے کیا کہا؟

اے نامہ بر، مرے سے ہُشنا و اسناں مجھے

یہی دن ہیں دعا لیلے کسی کے قلبِ مضطر سے
جدائی آ نہیں سکتی مری جاں پھر نئے سر سے

کٹے جاتے ہیں دل اُس ابروئے پیوستہ جوہر سے
کسی بانکے نے کیا خنجر کو گھمایا ہے خنجر سے

ملنا نہ ملنا یہ تو مقدر کی بات ہے — تم خوش رہو، رہو مرے پیارے جہاں کہیں
وقت تو دو ہی کٹھن گذرے ہیں ساری عمر میں — اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

تمہارے آتے ہی اک چین آ گیا دل کو — تمہارے جاتے ہی دنیا بدل گئی کیسی
کسی کے روکنے سے کب نرا دیوانہ رکتا ہے — بہار آئی، چلا میں، یہ دھری ہیں بیڑیاں میری

اس غزل کا مطلع تو زبان زدِ عام ہے

جگہ میں چٹکیاں لیتی ہے ہر طرزِ فغاں میری
کہاں سے داد دے گی بلبل دہن میرا، زباں تیری

ناکامیوں میں کوئی نہ کوئی تو راز ہے
مایوس کیوں ہوں میں کہ خدا کارساز ہے

لایا ہوں سی کے پھر جگر زخم زخم کو — پھر اُن کو اپنی نیم نگاہی پہ ناز ہے

کس طرح جوانی میں چلوں راہ پہ ناصح — یہ عمر ہی ایسی ہے، سجھائی نہیں دیتا

گیا وہ دورِ شاعر اب نہ رندی ہے اور نہ پیتے ہیں
ہماری مفلسی خود راہ پر ہم کو لگا لائی

ایسے ہزاروں اشعار ان کے ہاں ملتے ہیں، آخر عمر میں پیری اور شکایتِ زمانہ کے متعلق بے مثل رباعیاں کہی ہیں۔ صرف ایک رباعی نقل کرتا ہوں

دھندلی ہے نظر، نگاہ کرتے کرتے — تاریک ہے رو سیاہ کرتے کرتے
یارب، مجھے اب دامنِ رحمت میں چھپا
میں تھک گیا ہوں، گناہ کرتے کرتے

آغا شاعر کا دوسرا روپ

آغا شاعر صرف شاعر ہی نہ تھے، ادیب بھی تھے، جرنلسٹ بھی، اور ڈرامہ نگار بھی کئی اخبار نکالے، کئی ناول لکھے، مولانا ابوالکلام آزاد کے شریکِ کار رہے۔ ڈراموں

میں بھی بہت مقبولیت حاصل کی ۔ جی تو چاہتا تھا کہ ان کی نثر کے بارے میں بھی کچھ لکھوں ۔ لیکن وقت کی تنگی اور قلتِ گنجائش مانع ہے ۔

محب وطن

مرحوم نے وطن کے نغمے بھی خوب گائے اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ بستر مرگ پر بندے ماترم جیسی ایک اور نظم لکھی ، بڑے وسیع القلب لوگ تھے ۔

با مسلماں اللہ اللہ ، با برہمن رام رام

اُن کا مسلک تھا ۔

(از چمنستان ۔ مارچ ۱۹۳۱ء)

آغا شاعر مرحوم

میاں بشیر احمد

آغا شاعر مرحوم سے میری پہلی ملاقات شاید تیرہ چودہ سال گذرے ہوئی وہ مزنگ روڈ لاہور کی اُس کوٹھی میں جہاں میرے والدِ بزرگوار ہمایوں مرحوم رہا کرتے تھے۔ آئے، اور مجھ سے ملے، دورانِ گفتگو میں مجھے بتایا کہ وہ کیونکر میاں صاحب مرحوم سے واقف تھے، کب ملے، کہاں ملے، مجھے بھی وہ زمانہ یاد آگیا، جب لڑکپن کے زمانے میں اسکول کے دنوں میں مخزن دیکھا کرتا تھا، اُس وقت مخزن کی سبھی چیزیں تو ہماری سمجھ میں نہ آتی تھیں بالخصوص نثر کی بعض چیزیں، لیکن نظمیں سمجھ میں آئیں نہ آئیں ہم ضرور انہیں پڑھتے، اُن پر سر دھنتے اور اُن سے لطف اٹھاتے اسی ضمن میں آغا شاعر کی وہ مشہور غزل تھی۔

یہ کیسے بال بکھرے آئے، کیوں صورت بنی غم کی

اُس میں یہ مصرعہ مجھے کتنا پسند تھا ع خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی اور شاید یہ نظم بھی آغا شاعر کی تھی۔ ع ڈبیا، تو نے دل کو لے ہی لیا

جب پہلے پہل میں نے آغا شاعر کا نام سنا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ ان حضرت کا تخلص آغا ہے یا اور کیا؟ شاعر کسی کا تخلص ہو، یہ تو خیال ہی نہ آسکتا تھا جب معلوم ہوا کہ تخلص شاعر ہی ہے تو۔۔۔ دل میں عجیب گدگدی سی ہوئی، یہ تخلص مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ ہاں، کبھی کبھی یہ خیال ضرور آیا کہ یہ دوسرے شاعروں پر ایک قسم کی دست اندازی ہے۔ آغا شاعر سے پھر میری ملاقات کئی برس بعد ہوئی، وہ یہاں "المنظر" میں تشریف لائے،

اللہ واکبر۔ زمانے کی گردش نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ معاً مجھے آغا شاعر مرحوم کا وہ واقعہ یاد آگیا، جب انہوں نے مشاعرے میں اپنی آخری غزل پڑھی تھی۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

بس یہ تھی آغا شاعر کی حالت، جو زبانِ حال سے یہ کہہ رہی تھی۔ اللہ، اللہ زمانہ کیا چیز ہے، دنیا کیسی جگہ ہے اور انسان کیا وجود ہے؟ کبھی کیا؟ کبھی کیا؟ آغا شاعر مرحوم نے اسی زمانے میں مجھے اپنا قرآنِ مجید کا منظوم ترجمہ دکھایا۔ بلکہ کچھ حصہ پڑھ کر بھی سنایا پھر کچھ زمانہ ایسے ہی گزر گیا، یہاں تک کہ ایک دن خبر ملی کہ افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔

رسالہ چمنستان۔ دہلی

دلّی کے چند مصنّفین

بشیر احمد ہاشمی

آیئے ایک شاعر سے اور ملیں، چلئے، میرے ساتھ کشمیری دروازے چلئے اور حضرت آغا شاعر قزلباش سے ملئے، سنیئے صاحب، جن لوگوں نے آغا شاعر کو جوانی کے عالم میں دیکھا ہے وہ اب ان کو پہچان بھی نہیں سکتے، بھاری بھرکم جوانی سے بھرپور جسم، قابلِ رشک صحت، خمار آلود بڑی بڑی آنکھیں سُرخ و سفید رنگت، نہایت شاندار چڑھی ہوئی مونچھیں، صاف داڑھی، سر پہ مشہدی لنگی، وہ بھی ایک خاص انداز سے بندھی ہوئی، کبھی سوٹ بوٹ، کبھی افغانی شلوار، ماہ چلنتوں کی نظریں انہیں پہ پڑتی تھیں، جس زمانے میں ان کا شباب تھا۔ دلّی کا بچہ بچہ ان کے شعر گاتا پھرتا تھا، ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کی شاعری کا چرچا تھا، قدردان ان کو سر آنکھوں پہ بٹھاتے تھے۔

آغا صاحب کی شعرخوانی کا انداز بھی جداگانہ تھا، اگرچہ تحت اللفظ پڑھتے تھے لیکن ان کے بعد کم پڑھنے والوں کا بھی رنگ نہ جمتا تھا، شعر کیا پڑھتے تھے، شعر کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری ایّام بے کسی اور بے بسی کی عبرت ناک تصویر ہیں، آیئے فصیلوں ہی سے مڑ چلئے وہ صبح شام اکثر یہیں ٹہلا کرتے ہیں، یہ بھی دیکھ لیجئے یہ حضرت آغا شاعر قزلباش ہیں، دیکھیئے ہاتھ پاؤں پر سوجن ہے، اختلاجِ قلب کے مریض ہیں۔ معدہ اور جگر بالکل بیکار ہو چکے ہیں، ان کا حال تو دیکھا نہیں جاتا۔ کس قدر پریشان ہیں، ارے صاحب جن لوگوں نے آغا صاحب

کے عروج کا زمانہ دیکھا ہے، وہ ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر رو دیتے ہیں، کہاں وہ آغا شاعر جو محفلوں کا سنگار تھا، اور کہاں یہ آغا شاعر جو کس مپرسی کے عالم میں نیم جانوں کی طرح گردن ڈالے، گریباں چاک، ننگے سر، خراماں خراماں چلا جاتا ہے اور اپنے اس شعر کی تصویر بن گیا ہے۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

افسوس آسمانِ شاعری کا یہ درخشندہ ستارہ جو ایک مدت سے مصائب و آلام کی بدلیوں میں جھلملا رہا تھا، ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا

(از دید و شنید)

صاحبِ طرز شاعر

جگر مراد آبادی

حضرت آغا شاعرؔ مرحوم میرے بزرگ دوستوں میں سے تھے۔ مجسّم خلوص سراپا شرافت۔ وہ پہلے ایک دردمند انسان تھے اور بعد میں اپنے وقت کے بلند مرتبت اور صاحبِ طرز شاعر، اس رواروی کے عالم میں کہ فکر و توجّہ کی یکسوئی کا کوئی امکان نہیں میں مرحوم کے لئے دل کے انھیں مختصر تاثرات کی نذر مرحوم کی روح کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

۱۰ر مارچ ۱۹۵۳ء

آخری شاعر

جمیل احمد صدیقی

انیسویں صدی کے آغاز سے بھی پہلے اردو شاعری میں غزل کی دھوم دھام تھی اور پورے ہندوستان میں غزل اور داغ کی شاعری گونج رہی تھی، داغ کی زبان جس قدر آسان تھی، اسی قدر پورے براعظم ہند و پاک کے دُور دراز علاقوں تک سمجھی اور پسند کی جاتی تھی، داغ کی زندگی ہی میں دلی اسکول کے ایک اور نامور شاعر ملک میں مشہور و معروف ہو گئے تھے، جن کا نامِ نامی آغا شاعر دہلوی تھا، جو بعد میں جانشینِ داغ / افسر الشعراء جہاں استاد، جیسے القاب و خطاباتِ سے معروف ہوئے، آغا شاعر قزلباش نے بھی غزل سے ابتدا کی مُشاعروں میں ان کے غزل پڑھنے کے بعد کسی کا رنگ، نہ جمتا تھا۔ ان کی غزلیں تمام ملک میں زبان زدِ خلائق بن جاتی تھیں، اس طرح وہ نوجوانی ہی میں اپنے تمام معاصرین میں معروف و ممتاز ہو چکے تھے،

حضرت آغا شاعر درد مند اور حساس دل رکھنے والے انسان تھے، دیکھیے صبح کی جلوہ سامانیوں، نور کی زرپاشیوں اور قدرت کی رنگا رنگ بوقلمونیوں سے مسحور ہو کر گنگناتے ہیں؛

وہ صبحِ دم صبح کی وہ نور فشانی
شاداب چمن زار میں نتھرا ہوا پانی

وہ سبزہ خوابیدہ میں رہ رہ کے روانی
جس سے کرہ ہوا پوچہ الماس بھی پانی

سوزنگ سے مضمون اُترنے لگے دیکھو　　　عکسِ گُل خورشید اُبھرنے لگے دیکھو

وجد کے عالم میں اپنے خالق کی جانب رجوع ہوتے ہیں، اور وحدانیت کے گیت اس طرح الاپتے ہیں۔

وحدت ہی میں، تنہا نہیں شاہی تیری　　　کثرت میں بھی ہے، نیم نگاہی تیری
ذرّے نہیں اُڑتے یہ سوئے مہرِ مُبیں　　　انگشتِ غبار ہے، گواہی تیری

باطن میں تو ہر سانس کا دم ساز ہے تو　　　کھُلتا نہیں ظاہر میں، عجب راز ہے تو
اے کاش، دمِ جرم کوئی پہچانے　　　جو دل سے نکلتی ہے، وہ آواز ہے تو

سنہ ۱۹۱۰ء تک آغا شاعر کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ چکا تھا، ملک بھر میں ان کے سینکڑوں شاگرد پھیل چکے تھے؛ جو اُن سے بذریعہ ڈاک اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے، مشاعروں میں آغا صاحب کی غزل خوانی کے بعد بلا استثنا کسی کا رنگ نہیں جمتا تھا، وہ شیر کی طرح گرجتے تھے اور بغیر لاوڈ اسپیکر دُور دُور تک بیٹھے ہوئے سامعین کو مسحور بنا دیتے تھے۔ شعر پڑھتے وقت الفاظ کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود شعر کی تصویر بن جاتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۱ء کے لگ بھگ، جب سر عبدالقادر نے لاہور سے اردو کا مشہور رسالہ "مخزن" نکالا، تو ان کے ادیب ساتھیوں میں آغا شاعر کا نام بہت ممتاز ہے جنہوں نے "مخزن" کو صحیح معنوں میں ادبی اعتبار سے ہندستان کا بہترین رسالہ بنا دیا۔ علامہ اقبال، مولانا غلام بھیک نیرنگ، علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی دہلوی، چودھری خوشی محمد ناظر، آغا شاعر قزلباش اور مرزا اعجاز حسین وکیل، ان مشاہیر کے مضامین "مخزن" میں بڑے

شوق سے پڑھے جاتے تھے، آغا شاعر کی نئی غزلیں "مخزن" میں شائع ہوتے ہی ہندوستان بھر میں مشہور ہو جاتی تھیں۔ وہ جس پایہ کی نظم بہ آسانی لکھتے تھے۔ اسی طرح نثر کے شہ پارے ان کے قلم سے بے ساختہ نکلتے تھے، دلّی کی بولی، محاورے سے سجی سجائی نثر، اور قلعۂ معلےٰ کی دھلی دھلائی آسان زبان لکھنے پر انہیں بڑی قدرت تھی، جب چاہتے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ نگینوں کی طرح فقروں میں جڑ دیتے تھے۔ ان کی تحریریں ہندی اردو ہندوستانی جھگڑے کے زمانے میں بے حد مقبول اور مستند مانی جاتی تھیں۔ آصف علی بیرسٹر مرحوم نے اُسی زمانے میں ان کے مضامین کے تراشے زبان کی کمیٹی کے سامنے جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت سندر لال، اور مولانا عبدالحق جیسے اُدبا تھے بطور سند اور مثال پیش کئے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہلکی پھلکی اخلاقی اور سبق آموز کہانیاں لکھیں جو مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی بچوں سے متعلق تصنیفات کے بعد یقیناً زبان و بیان کی خوبیوں سے مالا مال تھیں، بعد والی کتابیں "آویزۂ گوش" اور "دامنِ مریم" اب کہیں نہیں ملتیں ۲۲-۱۹۲۳ء میں "دامنِ مریم لڑکیوں کے نصاب میں داخل کی گئی تھی، اُن کی نثر کا ایک۔ دل آویز ٹکڑا حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے مضمون "دلدار شاہ داتا" سے نقل کیا جا رہا ہے۔

"یہ میٹھی ٹکیاں جو اماں نے بڑے چاؤ سے پکائی ہیں، کھا تو رہی ہوں، لیکن رہ رہ کر تم یاد آ رہی ہو، قسم ہے نوالہ حلق سے نہیں اترتا، بہار کے دن ہیں، چاندنی بھی آج کچھ ایسی پیاری کھلی ہوئی ہے کہ بالکل معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے زمین تک دریائے نور ہے کہ لہریں مار رہا ہے، تاروں کے گوہرِ شب چراغ گو کسی قدر زیادتی سے اوپر تلے ہیں، لیکن پھر مرصع کار قدرت کی سلیقہ شعاری ہر نقطے سے ظاہر ہے یا

یوں کہنا چاہیے، کہ عروسِ شب نے اپنا حسن دوبالا کرنے کے لئے بال بال موتی پرو لئے ہیں، ہائے وہ چاندنی کا کھبت، وہ ہوا کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ، وہ پانی کا جھلمل جھلمل ہونا۔"

ہرچند آغا شاعؔ حسن و جمال کے دلدادہ، خود بڑے حسین اور حسن پرست تھے، نوجوانی کے کیف پرور رنگین ہنگاموں کے مرکز و آماجگاہ تھے۔ لیکن تحت الشعور میں مذہب غالباً ہمیشہ ہمیشہ انہیں اپنی طرف اُکساتا رہتا تھا!

عین نوجوانی کے عالم میں انہیں حضرت کلیم اللہ جہان آبادی سے عالمِ رویا میں فیض حاصل ہوا، اور وہ پھر ہمیشہ ہمیشہ حضرت شاہ کلیم اللہ کے عقیدت کیش رہے، خواجہ حسن نظامی دہلوی فرماتے ہیں۔

"میرے پیارے دوست آغا شاعؔ آج سے تیس سال پہلے ایک دفعہ میرے پاس آئے تو میں نے دیکھا کہ گیروا کرتا گلے میں ہے، قلندرانہ شان الا اللہ الا اللہ کے نعرے لگا رہے ہیں۔"

سُورت میں ان کی خدمت میں ایک بڑا حلقہ عقیدت مندوں کا ہر وقت حاضر باش رہنے لگا تو ان کی تنہائیوں میں خلل پڑنے لگا، انہوں نے سُورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا چاہا مگر ان کے عقیدت مندوں نے اصرار کیا کہ ہم ہرگز آپ کو نہ جانے دیں گے، ایک دن آپ حلقے میں بیٹھے تھے ایک گھنا درخت سایہ فگن تھا۔ الا اللہ کا ورد آپ فرما رہے تھے، بزم میں دو صاحبان اس خیال سے آئے تھے کہ دلدار شاہ دانا کی کشف و کرامت ظاہر ہونی چاہیے آپ نے فرمایا کہ اللہ پاک بڑی قدرت والا ہے جو اس کی جانب رجوع ہوتا ہے مالک بھی اس پر پیار کی نظر رکھتا ہے اور قدرت والے

خدا کے عاجز بندوں کی زبان میں بھی ذکر اللہ سے تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، یہ کہہ کر آغا صاحب دو زانو ہو بیٹھے اور الا اللہ کا نعرہ لگایا، گھنے درخت کا ایک موٹا ٹہنا چرچرا کر ٹوٹا مگر حلقے سے کافی دور جا کر گرا، ٹہنے کا گرنا تھا کہ ان دو صاحبوں نے آ کر پاؤں پکڑ لئے اور گریہ و زاری سے کہا "معاف کر دیجئے" پھر تو سائیلوں اور ضرورتمندوں کا وہ مظاہرہ ہوا کہ آغا صاحب بغیر بتائے ہوئے وہاں سے سیدھے دلی واپس آ گئے چونکہ عبادت شبینہ میں انہیں زحمتیں پیدا ہونے لگیں تھیں، سونت کو انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

شمع روشن تھا میں جب تک تھی جوانی باقی
جب وہ جانے لگی تو کر گئی خاموش مجھے

شمع روشن ذوتجلی جب ماند پڑنے لگی تو آغا شاعر باقاعدہ عابد شب زندہ دار ہو چکے تھے، راتوں کی تنہائیوں میں عبد و معبود کا براہ راست رابطہ رہا کرتا تھا

عبد و معبود میں کیا خوب ہی گذری شاعر
میں خطاوار رہا، یار خطاپوش رہا

آغا صاحب غزل کے بادشاہ تھے۔ نظم و نثر لکھنے میں انہیں قدرت تامہ حاصل تھی، انہوں نے ڈرامے بھی لکھے اور ناول بھی ڈراموں میں "حور جنت" بے حد مقبول ہو چکا ہے، اسی طرح ارمان، الوند و رضیہ، نقلی تاجدار، اور قتل نظیر، ناول و ڈرامے بھی خاصے مشہور ہوئے ہیں۔ انہیں اخبار نویسی سے بھی لگاؤ رہا ہے اخبار نویسی کی ابتدا غالباً ۱۸۹۷ء سے ہوئی جب انہوں نے اپنے آبائی مکان واقع کھڑکی ابراہیم علی خاں کشمیری دروازے دلی سے اپنا ہفتہ وار "آصف الاخبار" نکالا۔

اس میں ادبی مضامین نظم و غزل کے علاوہ ایک انگریزی ناول کا مسلسل ترجمہ خود آغا شاعر کے قلم سے شائع ہوتا تھا، ان کی دلّی کی ٹکسالی زبان بے حد پسند کی جاتی تھی، اس اعتبار سے ان کی ابتدائی اخبار نویسی ڈپٹی نذیر احمد اور خان بہادر ذکاءاللہ دہلوی جیسے انشا پردازوں سے خراج تحسین وصول کر چکی تھی، آپ کی سرپرستی میں دلّی سے "پنجہ نگارین" ایک ماہنامہ بھی شائع ہوا کرتا تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ دلّی کے بڑے بڑے مشاعروں کا انتخاب شائع ہوا کرتا تھا! اخبار وکیل امرتسر کے ادارتی بورڈ میں بھی شامل رہے ہیں" پاکستان کے فاضل ادیب جناب ممتاز حسن، ایک خط میں آغا صاحب کی بابت غالباً اسی زمانے سے متعلق اشارہ کرتے ہیں۔ "آغا مرحوم کو میں نے بچپن میں ایک دفعہ امرتسر کی تعلیمی کانفرنس میں سنا تھا، وہ دھوم دھام اب تک نہیں بھولا ہوں، ایک شعر مخزن میں دیکھا تھا۔ وہ نقش ہو گیا ہے ؎

اپنی سوزش کا کیا ہے شمع نے اچھا علاج
رکھ لیے ہیں دل میں پروانوں کے پر جلتے ہوئے

۱۹۱۹ء میں آپ نے ریاست جھالاواڑ راجپوتانہ سے "آفتاب" ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا یہ رسالہ اس زمانے میں کافی مقبول رہا اور کئی سال تک پابندی سے نکلتا رہا، علامہ اقبال کا کلام بھی اکثر اس میں شائع ہوتا رہا اور جوش ملیح آبادی کو روشناس کرانے میں آغا شاعر کا بڑا ہاتھ ہے" انھوں نے ان کی نظمیں بڑی تعریف کے ساتھ چھاپیں۔ اور انہیں مصورِ جذبات کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۲۷ء میں جب جھالاواڑ سے قطع تعلق کر کے لاہور میں قیام کیا تو یہاں سے دوبارہ "آفتاب"

کا اجرا ہوا اس وقت اُن کے عقیدت مند شاگرد دیوان شرر "آفتاب" لاہور کے نائب مدیر تھے۔ دیوان صاحب اب بمبئی کی فلمی دنیا میں براجمان ہیں۔ اس وقت "آفتاب"۔ "مخزن" کا ہم عصر تھا۔ "مخزن" کا بھی دورِ جدید مرحوم سر عبدالقادر کے "مخزن" کے بعد ابوالاثر حفیظ جالندھری کا مرہونِ منت ہوا۔

لاہور کے قیام کے دوران آغا صاحب کی صحبتوں میں پطرس بخاری، مولانا سالک، مولانا تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر تاثیر، مرزا فہیم بیگ چغتائی، شیخ عبدالطیف تپش، اور دیوان شرر شریک ہوا کرتے تھے۔ آغا صاحب نے اسی زمانے میں مولانا تاجور کے مکتبے کے لیے اور فیروز سنز کے لیے کچھ کتابیں لکھیں مثلاً "ہمارا آسمان" "بلبلانِ فارس" "روحِ نغمہ"، "گلِ صد برگ" وغیرہ۔

آغا شاعر کی زبان دانی کی دھوم جس طرح علمی حلقوں میں مچ گئی تھی، اسی طرح اُن کے فنِ شعر خوانی کے باعث عوام تک براہِ راست ان کی دسترس ہو گئی تھی۔ پبلک جلسوں، محرم کی مجالس، قومی اجتماعوں اور مشاعروں میں آغا شاعر اپنے کلام اور بے مثل شعر خوانی سے حاضرین کو گھنٹوں مبہوت رکھتے تھے ان کے پڑھنے کے بعد دیر تک ان کی گونجدار آواز لوگوں کے کانوں میں گونجا کرتی تھی۔ حسنِ کلام کے ساتھ پڑھنے کی خوبی غالباً مبدء فیاض نے انہیں بے پناہ عطا کی تھی، پورے ہندوستان میں ان کی شعر خوانی کی تو کوئی نظیر نہیں تھی، انجمنِ حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع ہے، ڈپٹی نذیر احمد صدارت فرما رہے ہیں۔ آغا شاعر دہلوی مشہور قومی نظم "یتیموں کی فریاد" پڑھ رہے ہیں۔ حاضرین نظم کی تاثیر سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں کہ دفعتاً بجلی کی روشنی گل ہو جاتی ہے۔ سر عبدالقادر اور دوسرے رکا برتی دیر تک کہ روشنی دوبارہ آجائے ماچس

جلا جلا کر روشنی کر رہے ہیں" اور لوگ آغا شاعر کو اسی طرح ساکت، بیٹھے سن رہے ہیں"

حیدر آباد دکن میں علامہ شبلی نعمانی نے آغا صاحب کو جب غزل پڑھتے سُنا تو بے حد تعریف کی اور فرمایا "ایسا باکمال پڑھنے والا میں نے آج تک تو سنا نہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں میر علی نواز خاں ٹالپور والئی خیر پور (سندھ) سے مراسم ہو گئے تھے نواب کا مجموعہ کلام انہیں کی توجہات کا مرہون منت ہے، نواب صاحب مرحوم علم دوست رئیس تھے، پاکستان بننے سے پہلے اس پاکستانی علاقے میں جہاں اردو کا چرچا برائے نام تھا، نواب صاحب کی ریاست میں لکھنؤ اور دوسرے مقامات سے شعراء آیا کرتے تھے، آغا شاعر قزلباش دلی سے تشریف لایا کرتے تھے۔ یہاں مولانا سُہا مجددی، حکیم احمد شجاع، فاخر لکھنوی وغیرہ سے بڑی ملاقاتیں رہی ہیں، انہیں ترجمے کا بھی شوق تھا اور یہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر میدان کے مرد تھے "انہوں نے اچھے اچھے ترجمے انگریزی، فارسی اور عربی سے کئے، شکسپیر کے کئی ڈرامے اور کہانیاں، انہوں نے آسان اُردو میں منتقل کیں، پھر رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعیات میں اس خوبی سے کیا کہ بالکل اصل کا مزا آجاتا ہے، رباعیات کا منظوم ترجمہ نواب صاحب خیر پور کے ایما سے "خمکدۂ خیام" کے نام سے شائع ہوا تھا اور بقول عطا اللہ پالوی" آغا شاعر کا ترجمہ بہترین ہے! ترجمے کی شان ملاحظ فرمائیں۔

خیام: آمد سحرے ندا زمے خانۂ ما
کے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ زمے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

آئی یہ ندا صبح کو میخانے سے ‏ ‏ ‏ ‏ اے رندِ شراب خوار دیوانے سے
اُٹھ جلد بھریں شراب سے ساغر ہم ‏ ‏ ‏ ‏ کم بخت چھلک جائے نہ پیمانے سے

آغا شاعر

آغا صاحب مذہبی خیالات اور اخلاقیات کے دلدادہ تھے انہوں نے سوچا کہ کلام پاک اگر آسانی سے لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے تو کتنا اچھا ہو، اس خیال کے آتے ہی انہوں نے اس طرف توجہ کی مگر یہ سوچ کر کہ اتنا بڑا کام کس طرح مکمل ہوگا، کبیدہ خاطر ہو گئے، رات کو خواب میں دیکھتے ہیں کہ مسجد میں حوض کے کنارے وضو کر رہے ہیں۔ کلی کرتے ہی بجائے پانی کے منہ سے ننھی ننھی سرخ سپید سبز رنگ برنگ کی چڑیاں نکل کر اڑ رہی ہیں۔ اور خوش الحانی سے مترنم ہیں۔ اس کی تعبیر انہوں نے یہ لی کہ فالِ نیک ہے اور بسم اللہ کہہ کر کلام پاک نظم میں ترجمہ کرنے میں مصروف ہو گئے، سالہا سال کی محنت کے بعد انہوں نے اپنی زندگی میں اس عظیم الشان کام کو انجام دے لیا تھا، وہ پُر امید تھے کہ اب غفور الرحیم انہیں ضرور بخش دے گا۔ الحمد کا پارہ ۱۹۲۲ء میں دلی سے پہلی مرتبہ شائع ہوا، بیشتر علمائے اسلام کو بھیجا گیا اور اکثر نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

اس منظوم ترجمہ کلام پاک کو مرحوم نے اپنی زندگی میں ہی مکمل کر لیا تھا، اس کے تین پارے بھی طبع ہو چکے تھے، اس منظوم ترجمہ کا التزام یہ ہے کہ پہلے آیۂ مبارک اس کے نیچے شاہ عبدالقادر دہلوی کا نثر کا ترجمہ اور اس کے نیچے نظم میں ترجمہ۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی اردو کے ممتاز اور لائق ادیب رکن تھے، لیکن ان کا یہ مذہبی علمی اور ادبی شاہکار

یقیناً دنیا میں پہلی مثال قابلِ ستائش اور ان کی شہرت و بقا کے لئے کافی ہے، منظوم ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہے نام سے خدا کے آغاز کا اُجالا

جو مہربان بڑا ہے، بیحد جو رحم والا

الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم

تعریف اُس خدا کی جو رب ہے عالموں کا

جو مہرباں بڑا ہے، بیحد جو رحم والا

مالک یوم الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین

محشر کے دن کا مالک (روزِ جزا کا والی)

تجھ کو ہی پوجتے ہیں (ہم تیرے ہی سُوالی)

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم

سیدھی ڈگر پہ لے چل، ثابت قدم بنا دے

نعمت جنہیں عطا کی (ان کی روش سُجھا دے)

غیر المغضوب علیھم و لا الضالین

نے ان کی (راہ) جن پر قہر و غضب ہوئے ہیں

نے وہ (کہ جو بھٹک کر گمراہ ہو گئے ہیں

۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو دلی میں عصر و مغرب کے درمیان واصل بحق ہوئے، اور آبائی قبرستان میں متصل صفدر جنگ مدفون ہوئے۔ ان کے عزیز ترین شاگردوں

میں مہاراج بہادر برق، دیوان شرر، ڈاکٹر ظفر الحسن آثر صدر شعبہ فلاسفی علی گڈھ یونیورسٹی، نسیم دہلوی اور گوہر دہلوی زیادہ مشہور ہوئے، آپ کے پختہ مزار پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ کندہ تھا۔ "آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے"۔ اور خود مرحوم کا یہ شعر بھی کندہ تھا۔

مسکن ہی کوئی قبر سے بہتر نہیں ملتا　　آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا

مگر آزاد ہندوستان کی حکومت نے اب ان کا مزار گرا کر وہاں آفیسرز کوارٹر بنوا دیئے ہیں، اس حادثے کے متعلق خود آغا صاحب مرحوم نے اپنے ایک شعر میں پیش گوئی فرما دی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

آخر یہ ہوا درجہ، شاعر موئی مٹی کا
ٹھکرا کے ستمگر نے بے نام و نشاں کر دی

انجام۔ کراچی
۱۲ر مارچ ۱۹۶۴ء

دلّی کی آب رُو

جوشؔ ملیح آبادی

حضرت آغا شاعر دہلوی حضرتِ داغؔ کے شاگردِ رشید، خود جگت اُستاد، بے نظیر غزل گو، تحت اللفظ غزل سراؤں کے بادشاہ، دہلی کی آبرُو۔ وضع داری کے قطب، دینِ انسانیت کے پیمبر اور شرافت کے اوتار تھے۔

آغا صاحب کی زبان میں وہ شیرینی تھی جیسے لعلِ نگار، وہ لوچ تھا جیسے شاخِ گُل، اور وہ روانی تھی جیسے آبِ رکنا باد۔ آغا صاحب صرف ہماری قدیم غزل گوئی کے اعلیٰ نمونہ تھے بلکہ قدیم شرافت، ہماری قدیم سادگی اور ہمارے قدیم عادات و اطوار کے بھی علمبردار تھے، ان کے ادبی کارنامے ہمارے لئے باعثِ استفادہ ہی نہیں باعثِ فخر بھی ہیں۔

آغا صاحب ہر چند مجھ سے عمر میں بڑے تھے لیکن انکی تکلف نا آشنا سادگی نے مجھے ان کی خدمت میں گستاخ بنا دیا تھا۔

آغا صاحب ایک خاص لہجے، ایک خاص آواز، اور ایک خاص تبسم کے مالک تھے، ان کی آواز کا زیر و بم، معنی خیز تبسم، اور تبسم میں آمیزشِ غم ایک خاص چیز تھی۔ آغا صاحب زندگی کا ہمیشہ ماتم کیا کرتے اور ہر ملاقات کے وقت کہا کرتے تھے "یہ آخری ملاقات ہے اب میں زندہ نہیں ملونگا"

آغا صاحب کو حقے اور سگرٹ سے سخت نفرت تھی اور جب کوئی آپ کے سامنے حقہ یا سگرٹ پیتا تھا تو وہ آگ بگولا ہو جاتے تھے، میں اُن کی کس کس بات کو یاد کروں؟

میں نے زندگی میں آج تک کسی پیرمرد کی باتوں میں آغا صاحب کا سا بھولپن نہیں

دیکھا، وہ عجیب باتیں کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ پیرانہ سالی کے پردے میں کوئی بچہ بول رہا ہے۔

آغا صاحب کے ابھی مرنے کے دن نہیں تھے، لیکن اس نامراد ہندوستان میں کسی صاحب کمال کا اتنے دن تک بھی زندہ رہ جانا در اصل ایک معجزہ ہے، ہندوستان سے زیادہ ناقدرشناس کوئی ملک اس کرۂ زمین پر نہیں ہے، آج تک جس قدر بھی صاحب کمال اس اندھے ملک میں مر چکے ہیں، میں تو یہی کہوں گا کہ وہ طبعی موت نہیں مرے، بلکہ ہندوستان نے اُن کا گلا گھونٹ کر مارا ہے۔

جوانی میں آغا صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے اور ان کی تصویر بھی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ نہایت خوب رو انسان تھے، آخر میں آپ بے حد کمزور ہو گئے تھے، چہرے پر افسردگی کی اس قدر گہری مہریں زمانے کے ظالم ہاتھ نے ثبت کردی تھیں کہ کوئی قیاس ہی نہیں کر سکتا تھا کہ آغا صاحب جوانی میں خوش جمال رہے ہوں گے، لیکن چہرے کی اس افسردگی کے باوصف اُن کے خال و خط اور تبسم میں ایک خاص کشش تھی جو دل کو موہ لیتی تھی۔

اُن کا شباب بازار مصر کے مانند تابناک تھا اور اُن کا شیب زندانِ یوسف سے زیادہ تاریک، اُن کی خوش آثار زندگی کی بد انجامی پر تو صبر کیا جا سکتا تھا۔ مگر روزگار کی سفاکی نے جو دوسرا وار اُن پر کیا اُس پر کیوں کر صبر کروں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے برسوں مسلسل خون تھوک کر قرآن حکیم کا جو منظوم ترجمہ کیا تھا وہ آج تک شائع نہ ہو سکا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سعی کی تھی کہ اُسے چھپوا دیں مگر ایسے مواقع پیش آئے کہ وہ بیچارے کچھ نہ کر سکے۔ پاکستان بن جانے کے بعد اس امر کا یقین پیدا ہو گیا تھا

کہ اب اس چراغِ ہدایت کے روشن کرنے میں تاخیر نہیں کی جائے گی۔ لیکن یہ تمنّا اب تک تو پوری نہ ہو سکی۔

آغا صاحب! آپ کی یاد میں آنسو کیوں نہ بہاؤں، ہماری مردہ پرستی بھی آپ کے کام نہ آئی، ہر صاحبِ کمال کو اس کی موت کے بعد یاد کیا جاتا ہے لیکن آپ کے مرنے کے بعد بھی دُنیا آپ سے بے انتہا سرد مہری برت رہی ہے۔ آپ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں ؎

توبہ کارے کسے نمی آئی ‌‌‌‌‌‌ بہ کنارے کسے نمی آئی
بچہ اُمید می تو اں مُردن ‌‌‌‌‌‌ بر مزارے کسے نمی آئی

رسالہ شعلہ و شبنم دلّی ۱۹۵۳ء
(اخبار جنگ کراچی، مارچ ۱۹۷۰ء)

داغ کا جانشین

مولانا حامد حسن قادری

آغا شاعر دہلوی کی وفات سے گویا ایک نہیں، کئی ہستیاں ایک ساتھ اٹھ گئیں، قوم کا محترم، قدامت کا نمونہ، دلی کا زبان داں شاعری کا استاد اور داغ کا جانشین۔

مجھے آغا صاحب سے ذاتی نیاز حاصل نہ تھا، لیکن ان کے ساتھ میری نیازمندی بہت قدیم ہے، خوب یاد ہے۔ ۳۲-۳۳ برس سے کم نہ ہوئے ہوں گے، میری طالب علمی کا زمانہ تھا، رسالہ مخزن لاہور میرے پاس آتا تھا۔ اس میں میرے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ مخزن کے ایک پرچے میں آغا شاعر صاحب کی ایک غزل چھپ کر آئی، مختصر غزل تھی۔ لیکن زمین نئی اور دلچسپ تھی، یعنی حج ہے، کج ہے۔ ردیف ہے۔ اس کا ایک شعر بہت پسند آیا تھا جو اب تک یاد ہے۔

دروازے پہ اس بت کے سو بار ہمیں جانا
اپنا تو یہی کعبہ، اپنا تو یہی حج ہے

اسی غزل کے ایک شعر پر خوب بحث رہی تھی، فرماتے ہیں۔

اے ابروئے جاناں تو اتنا تو بتا ہم کو
کس رُخ سے کریں سجدہ؟ قبلے میں ذرا کج ہے

"کجی" کے معنوں میں "کج" کبھی نہ دیکھا تھا، اس کی تحقیق درپیش رہی۔

آغا صاحب کی زباندانی و استادی کا اُس وقت بھی شہرہ تھا، اس لئے ان کی زبان ہی کو سند مان لیا گیا تھا،

خیر" یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا، اس کے بعد جب میں نے شاعری کا مطالعہ کیا تو آغا شاعر کے مرتبے کو پہچانا، حضرت داغ دہلوی کے کلام سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، ابتدا میں تو ممکن ہے اُن کے اسی کلام سے عقیدت پیدا ہوئی ہو جو عام پسند ہے، لیکن بعد میں میں نے اندازہ کیا کہ مرزا داغ جن کی شاعری کو پنڈت چکبست لکھنوی وغیرہ نے "عیاشانہ شاعری" سے تعبیر کیا ہے، ایسے طرز کے موجد تھے، جو ان سے شروع ہو کر انہیں پر ختم ہو گئی، کلامِ داغ کے خزف ریزوں میں وہ جواہر پارے ملے ہوئے ہیں کہ ایسی تراش و خراش اور ایسی آب و تاب کے ساتھ اردو شاعری میں نہ کسی نے پہلے پیدا کئے نہ بعد کو آج تک، کوئی پیدا کر سکا۔

لطفِ زبان و حسنِ بیان کے ساتھ جدتِ ادا ایسی نکالی ہے کہ اردو اور غزل اور دہلی کو ہمیشہ ان پر ناز رہے گا، ممکن ہے بعض نقادوں کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا، سنجیدہ سے سنجیدہ، پارسا سے پارسا، فارسی و اردو کا شاعر ایسا نہیں گذرا، جس نے وہ کچھ نہ کہا ہو جو داغ نے کہا ہے، جس کے دیکھنے سے حیا آنکھیں نیچی نہ کرلے، اور جس کے سننے سے تہذیب کانوں پر ہاتھ نہ دھرلے۔ اور اس پر بھی انہی بزرگوں کو گنجفۂ شاعری کا میر معرکۂ نکتہ سنجی کا غالب، اور ملکِ سخن وری کا امیر مانا گیا ہے، یہ الزام تنہا داغ پر نہیں ہے، میں نے یہ بات دیکھ کر

نواب مرزا داغ کے چاروں دیوانوں کا سخت انتخاب کیا، ایسا کہ ان کے پست و ادنیٰ اشعار بالکل نکال دیئے، بلکہ اُن کے بہت سے شوخ اشعار بھی خارج کر دیئے، صرف بہترین اور انفرادی شوخ رنگ کو باقی رکھا، اور اس انتخاب پر ایک بسیط مقدمہ لکھ کر کمالِ داغ کے نام سے شائع کیا،

جب میں نے داغ کے انفرادی رنگ کو سمجھا اور اس کا اندازہ کیا کہ یہ رنگ ایسے کمال کے ساتھ خود داغ کے شاگردوں سے بھی نبھنا آسان نہیں ہے تو اس کی جستجو ہوئی کہ تلامذۂ داغ میں سے کون کون اُستاد کے قریب پہونچ سکے ہیں، اُن میں آغا شاعرؔ ہی وہ شاگردِ رشید نکلے جنھوں نے اُستاد کی زیادہ سے زیادہ پیروی کی چونکہ اس مختصر مضمون میں تلامذۂ داغ پر تبصرہ مقصود نہیں ہے، اس لیے اوروں کا ذکر نہیں کرتا،

آغا صاحب کے حالات اُن کی وفات (۱۲ ار مارچ ۱۹۴۰ء) کے بعد مختلف اخباروں میں شائع ہوتے ہیں، لیکن اتفاق سے ان میں سے کوئی پرچہ اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں ہے، اس لیے ان کے ذاتی حالات سے قطع نظر کر کے صرف بعض شاعرانہ احوال و ماحول کی طرف اشارہ کرتا ہوں، آغا صاحب نے ابتدائے مشقِ سخن سے حضرت داغ دہلوی سے فیض سخن حاصل کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن دُور کی شاگردی کچھ شاگردی نہیں ہوتی،

بساکیں دولت از گفتار خیزد

آغا صاحب کو خوش نصیبی سے استاد داغ کی دولتِ دیدار و گفتار میسّر آئی دو بار حیدر آباد گئے، اور عرصے تک اُستاد کی خدمت میں رہے، اُستاد کی صحبت

کسی طالبِ شاعری کے لیے ایسی ہی کیمیا ہے۔ جیسی مرشدِ کامل کی صحبت، سالکِ طریقت کے لیے، جس شخص کو یہ یا وہ کبھی میسّر نہیں آتی وہ نہ اس کے فیض کو سمجھ سکتا ہے، نہ اُس کی کرامت کا تصور کر سکتا ہے۔ کبھی استاد کی زبان سے ایک نکتہ، ایک اصلاح کی توجیہہ، ایک شعر کا انتخاب، ایک موازنہ و مقابلہ، سلوکِ سخنوری کے وہ مدارج طے کرا دیتا ہے۔ جو دور کے شاگردوں کو برسوں کتابوں سے سر مارنے سے حاصل نہیں ہوتے۔ آغا شاعر نواب نصیر الممالک سفیر ایران کی مصاحبت میں بھی رہے، اور وہاں سے افسر الشعراء کا خطاب پایا۔ پھر ایک مدت تک مہاراجہ جھالاواڑ کے درباری شاعر رہے، وہیں سے ایک ماہوار رسالہ "آفتاب" نکالا، جس کے لیے مشہور اہلِ قلم سے مضامین حاصل کیے، اور خود اپنے استاد کے فیضِ سخن کے متعلق طویل مقالہ لکھا۔

آغا شاعر کا کلام سنہ وار مرتب نہیں ہوا ہے پھر بھی اُن کا اوّل و آخر کا کلام الگ الگ ہو سکتا ہے، پہلا دیوان (تیر و نشتر) اب سے ۳۰ - ۳۵ برس پہلے شائع ہوا تھا۔ وہ اُن کی جوانی کا کلام ہے، آغا صاحب لڑکپن سے شوخ مزاج اور چُلبلی طبیعت رکھتے تھے اور بقول شیخ سعدی "در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی" دوسرے آغا صاحب حضرت داغ دہلوی کے رنگ و طرز کو پسند کرتے تھے، اور ان کا اتباع کرتے تھے، تیسرے اُس زمانہ کی غزل میں کھلے ڈھکے سب معاملے آزادی و بے باکی سے لکھے جاتے تھے، اور اس کو عیب نہ سمجھتے تھے، چوتھے اگلے وقتوں کے لوگ اکثر نیک کردار، پاک نفس اور صاف گو ہوتے تھے، اس لیے ان کے رندانہ و بے باکانہ اشعار اکثر حالتوں میں صرف قال ہوتے تھے، حال نہ تھے،

اس لئے اُن کو کہنے میں تامل نہ ہوتا تھا، اور سننے والے اُن کے اقوال کو اُن کے افعال و کردار نہ سمجھتے تھے، چنانچہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ میر دردؔ رحمتہ اللہ علیہ جو مشہور و مسلم اولیاءُ اللہ اور صوفیائے کرام تھے۔ اور حضرت امیر مینائیؔ رحمتہ اللہ علیہ جو مانے ہوئے صاحبدل و صوفی اور عالم و مفتی تھے۔ سب نے ہر طرح کی کہنی ان کہنی کھلے لفظوں میں کہی ہے، لیکن کس کی مجال ہے کہ ان کی سیرت اور کیریکٹر پر انگلی اٹھا سکے، جب یہ بات ہے تو حضرتِ داغؔ اور جناب آغا شاعرؔ کو تو کوئی ولی و صوفی بھی نہیں کہتا، پھر وہ بھی ویسا ہی کیوں نہ لکھتے۔ جو سب لکھ گئے ہیں، یہ وجہ ہے کہ آغا شاعرؔ کے اس طرح کے اشعار کی جن کا نمونہ یہ ہے:۔

نہ چھیڑو، اب شکستہ خاطروں کو
کوئی منھ سے اٹھائے گا کہاں تک

بس، چلو، ہو چکا، اتنے نہیں بنتے توبہ
دیکھنا رات گذر جائے نہ ساماتوں میں

ماشا اللہ، رقیبوں کا یہ جمگھٹ آہا
آج تو شمع بنے بیٹھے ہو پروانوں میں

نہ دیں گے، نہ دیں گے، نہ دیں گے دل اپنا
چلو، جاؤ بس، خوب سمجھا ہوا ہے

یہ میں نے بہت ہلکے شعر انتخاب کئے ہیں، اس سے بہت گہرا اور صاف بھی کہا ہے۔

۲۔ اسی رنگ میں ایک یہ بھی جھلک تھی کہ حلیہ، انداز، لباس، زیور وغیرہ کا ذکر بے تکلف لکھا کرتے تھے، یہ طرز دہلی سے زیادہ لکھنؤ کی شاعری میں ہے،

بلکہ اس کی کثرت لکھنؤ کی تقلید ہی سے دہلی والوں کے کلام میں ہوئی چنانچہ آغا شاعر بھی فرماتے ہیں۔

ہاتھ رکھ کر سوئے ہو، گیسو پیچھے ہیں؟ کیا ہوا!
کیوں تمہارا پھول سا رخسار آ.ں ہو گیا۔؟
حُسنِ رخسار سے ہے کان کی بجلی روشن
مہر کے ساتھ، جھلکتا ہے قمر کا ٹکڑا

۳۔ قدیم زمانے کا ایک اور اسلوبِ بیان یہ ہے کہ عالمانہ قابلیت اور شاعرانہ کاری گری کے لیے بھاری اور مشکل مضامین پیدا کیا کرتے تھے، اصلی جذبات اور سچے واقعات تو کچھ بھی نہ ہوتے تھے، یا برائے نام ہوتے تھے، لیکن تشبیہوں، استعاروں، لفظی رعایتوں اور دقیق بندشوں سے ایک خوشنما گلدستہ بنا دیا کرتے تھے، یہ طریقہ اردو شاعری کی بالکل ابتداء سے موجود تھا۔ لیکن پھر لکھنؤ کے شاعروں نے تو گویا اس کا ٹھیکہ لے لیا اور شاعرانہ پیشہ بنا لیا، بہر حال یہ بھی بیشک ایک قسم کا کمال تھا اور ایک طرح کی استادی، چنانچہ آغا شاعر کے ہاں اس کے نمونے دیکھیے،

خاکِ تربت سے مری، پیکاں اُگیں گے تیر کے
مر گیا ہوں یادِ مژگانِ بتِ سفاک میں

زیبا ہے اس قبا میں گریباں ہلال کا
دامن ہے آسماں پہ ہمارے خیال کا

واہ کیا موزوں ہے یہ مصرعہ کسی اُستاد کا
مرتا شاعر تری خوش قامتی کو دیکھ کر

اپنے دیوانے کو چھڑیاں ماریے شمشاد کی
تازیانے کی ضرورت؟ گیسوئے مشکیں تو ہیں

دیکھیے ان شعروں کو پڑھ کر شاعرانہ مسرت پیدا نہیں ہوتی، کوئی جذبہ نہیں اُبھرتا دل پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ہاں دماغ متاثر ہوتا ہے، شاعر کے کمالِ علم کا قائل ہونا

پڑتا ہے، مضمون پیدا کرنے کی راہیں کھلتی ہیں، اس طرح کے شعروں کا شاعری میں بس یہی فائدہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ رنگ آغا صاحب یا اُن کے استاد کا اصلی رنگ نہیں ہے، یہ شعر سازی ان کا پیشہ نہ تھی، یہ گویا شاعری کی خانہ پُری ہے، اور بھی سب کہا کرتے تھے، انہوں نے بھی چند شعر کہہ لیئے۔

۴- اب آغا صاحب کا اصلی رنگ دیکھیئے، لطفِ زبان، سلاست و صفائی، روز مرہ، محاورے کی دل کشی، بول چال کی بندش، بہتر سے بہتر ہے۔

بہت رونا مجھے آتا ہے غنچوں کے تبسم پر ۔۔۔ فقط کھلنے ہی کی ہے دیر ساری بکس جھگڑے ہیں
ادجنوں ہوش کی لے دست درازی کب تک ۔۔۔ دیکھ لے، اب تو کوئی تار گریباں میں نہیں
جاتی رہی پہلو میں رہا کرتی تھی اک چیز ۔۔۔ تم برہم نہ ہوں، کچھ آپ سے کہتا تو نہیں میں
خدا جانے کہاں کی دل لگی تھی، دردِ کی دل سے ۔۔۔ ابھی چونکا دیا پھر، کہا لگی تھی آنکھ مشکل سے
کبھی نمک ہے، کبھی تیر ہیں، کبھی چرکے ۔۔۔ ملی ہیں زخمِ جگر، منہ بھرائیاں کیسی
مرا قصہ سنا، سن کر ہنسے، ہنس کر یہ فرمایا ۔۔۔ ابھی جو کہہ رہے تھے، کیوں جی، یہ قصہ کہاں تک ہے
اس کی چٹکی سے چھٹا، سینے میں اترا، دل میں تھا ۔۔۔ گیا ٹھکانہ توڑ کا، پلٹے تو دیکھو تیر کے
کسی کے روکنے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے ۔۔۔ بہار آئی، چلا میں، یہ دھری ہیں بیڑیاں میری
غریبوں کے مرقد کو ٹھکرانے والے ۔۔۔ سنبھل جانے والے، سنبھل جانے والے
گری، گر کر اٹھی، پلٹی تو جو کچھ تھا اٹھا لائی ۔۔۔ نظر کیا کیمیا تھی، رنگ چہروں سے اڑا لائی

ان شعروں کا پہلے شعروں سے مقابلہ کر کے دیکھیئے، اور سوچیئے کہ ان میں کیوں زیادہ لطف و اثر ہے؟ اگر زبان و محاورے کی تاثیر ہے تو یہ بات اُن شعروں میں بھی تھی جو پہلے اور دوسرے نمبروں میں پیش کئے گئے تھے، دیکھئے وہاں مضمون و جذبات

نامناسب ہونے کے سبب سے لطف کم ہو گیا تھا، یہاں واقعات و خیالات سب واقعی اور اصلی اور درست و موزوں ہیں، اس لیے دلکشی زیادہ ہے، اسی طرح مضمون آفرینی اور تخیل آرائی ۳ کے اشعار میں بھی ہے، لیکن صداقت و اقعیت نہ ہونے کی سبب تاثیر پیدا نہ ہو سکی۔

لیکن محاورات بندی کے شوق میں کہیں کہیں آغا صاحب نے وہ محاورے لکھ دیئے ہیں جو عورتوں کی زبان پر سجتے ہیں، مثلاً

کبھی ساون کی جھڑی ہو، کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے مرے اللہ، کہ، چھاجوں برسے

کوسنے ہیں ستانے والے کو ——— آپ سے تو کوئی خطاب نہیں

پھر بھی یہ شعر اپنے رنگ میں لاجواب ہیں، اس خطاب کا کیا کہنا ہے:
"آپ سے تو کوئی خطاب نہیں"

کسی شاعر کا کمال اور اُستادی جانچنے کے لیے بہت سے گُر، نکتے اور انداز ہیں، میں دو ایک کا ذکر کرتا ہوں، ایک چیز تشبیہ ہے کہ یہ جتنی موزوں، صحیح اور نئی ہوگی اتنی ہی پُر لطف و دلکش ہوگی، آغا شاعر کلی اور پھول کی نئی اور نرالی تشبیہ لکھتے ہیں۔

لو ہم بتائیں غنچہ و گل میں ہے فرق کیا؟
اک بات ہے کہی ہوئی، اک بے کہی ہوئی

یہ تشبیہ بالکل نئی ہے، کبھی شاعر پرانی اور معمولی تشبیہ کو عجیب و جدید بنا دیتا ہے، ابرو کی تشبیہ ہلال سے اتنی عام ہو چکی ہے کہ اس میں کوئی لطف باقی

نہیں رہا ہے. لیکن آغا شاعر اپنے حسنِ تخیل سے اس کے کہنے کا نیا اسلوب نکالتے ہیں، اور اب یہ معلوم ہوتا ہے. کہ گویا ابرو اور چاند آج نئے دیکھے ہیں، شعر سنیئے

خیالِ ابروئے پُرخم سے اک تصویر پیدا ہے ذرا تم سامنے آنا کہ ہم نے چاند دیکھا ہے

اس شعر پر اردو شاعری کو فخر و ناز ہے، اس خوبیٔ بیان کو جدتِ ادا کہتے ہیں جدتِ ادا کی ایک اور مثال دیکھیئے.

اُدھر جو دیکھتا ہے، وہ اِدھر بھی دیکھ لیتا ہے
تری تصویر بن کر، ہم تری محفل میں رہتے ہیں

یہ مضمون درجنوں شاعروں نے لکھا ہے، لیکن اس طرح شائد ہی کسی نے کہا ہو، شاعری اصل میں جدتِ بیان ہی کا نام ہے، ورنہ اگلے لوگوں نے کیا بات کہنے سے چھوڑ دی ہے، اب شاعر کا کمال یہی ہے کہ کہی ہوئی بات اس طرح کہے کہ سننے والا سمجھے کہ یہ بات پہلے نہ سنی تھی یا اس انداز سے کسی نے نہ کہی تھی، آغا شاعر کی جدتِ ادا اور دو ایک جگہ دیکھیئے.

جاتے ہو تم کدھر صفِ محشر سے نکل کر؟ دامن نہ ہوا خلا کے لئے دھجیاں کہیں
مری وحشت کو یہ بے تابیاں ہیں ذرا دیکھوں، صبا دامن کہاں سے؟
یہ چمن کا ہے تصور کہ قفس میں پہروں ڈالیاں جھومتی ہیں، مرغِ گرفتار کے پاس
اب نیم نگاہی میں بھی ہے برق کا عالم کیا جانے کہا کیا تری شوخی نے حیا سے

دوسرے مصرعوں کے اندازِ بیان دیکھیئے، کہ اک ذرا نئے طرز سے بات کہہ کر مضمون میں تازگی پیدا کر دی، کہنا تھا کہ پہلے طبیعت میں حیا تھی اب شوخی آگئی ہے، اس نے تڑپا رکھا ہے، شعر کو پھر پڑھ کر دیکھیئے کہ اس بات کو کس طرح کہا ہے

دوسرے شعر میں جوشِ وحشت کو بیان کرنا تھا، لیکن خوب کہا ہے، اس بے تابی کا کیا ٹھیک ہے کہ وحشت منتظر ہے کہ، ذرا دیکھوں سیا دامن کہاں سے ادھر سلے اِدھر چاک کر دوں اب بغیر تعینِ مضامین اور توضیحِ بیان کے آغا صاحب کے چند منتخب شعر پیش کرتا ہوں۔

دم نہ نکلا صبح تک شامِ الم ـــــ حسرتوں نے رات بھر پہرا دیا

کعبہ سے دیر، دیر سے کعبہ ـــــ مار ڈالے گی راہ کی گردش

تم کیا سنو گے، واہ ستمگر سے کیا کہیں ـــــ ہاں کوئی اہلِ درد ہو، پتھر سے کیا کہیں

پھرتا نہیں کبھی، جو کسی طرح، دن پھریں ـــــ یہ بھی تری نظر ہے، مقدّر سے کیا کہیں

سدھاویں، بھلا آپ کیا دیکھتے ہیں ـــــ جنازہ کسی کا، تماشا کسی کا

سنبھالا نہ تم نے، اجل نے جلایا ـــــ کہیں کام رُکتا ہے، داتا کسی کا

آدمی، آدمی سے ملتا ہے ـــــ بات کرنی تو کچھ گناہ نہیں

روز فرماتے ہیں، ہم چاہیں تو مرجاؤ ابھی ـــــ دیکھنا، کیا مری تقدیر بنے بیٹھے ہیں؟

تلوّن کی حکومت ہے تو، شوخی کا زمانہ ہے ـــــ نگاہِ یار میں آئے، مزاجِ یار میں آئے

تم نہ سمجھے تھے کہ مایوسیاں کیا کرتی ہیں ـــــ ہم نہ کہتے تھے کہ بیمار گھڑی بھر میں نہیں

دل فریبی، لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی ـــــ بہ ستمگر خاک ہو کر بھی، تو گل بوٹے ہوئے

چاہنے والے تری فرقت میں جی سکتے نہیں ـــــ زندگی سے ہیں وفاداروں کے جی چھوٹے ہوئے

انکارِ گریہ پر مرے، کس ناز سے کہا ـــــ آنسو نہیں، تو پونچھتے ہو آستیں سے کیا

چادر چڑھائی، چاکِ گریباں نے پھول سی ـــــ لاکھوں بناؤ، دے گئیں یہ دھجیاں مجھے

لو آؤ، میں بتاؤں طلسمِ جہاں کا راز ـــــ جو کچھ ہے وہ خیال کی مٹھی میں بند ہے

رنج وخوشی، ہوس وتمنا، سب ایک ہیں ـــــ چولے بدل رہا ہے یہ پتلا خیال کا

آخر کے دو شعروں میں ایک بات دو طرح کہی ہے اور دونوں انداز خوب ہیں۔ یہ جدتِ ادا، آغا صاحب کے اُستاد، فصیح الملک، جہان اُستاد نواب مرزا داغ کا وہ کمال ہے۔ جو لطفِ زبان کے ساتھ مل کر اس قدر دل کش اور اتنی کثرت سے مشکل سے کسی دوسرے اُستاد کے کلام میں موجود ہے، خود آغا شاعر اپنے اُستاد کی اس خصوصیت کا ذکر اپنے رسالہ "آفتاب" میں ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"وہ قادر الکلام تھے، اور ایسی اچھوتی طبیعت لے کر آئے تھے۔ جس کا شائبہ بھی کسی پر نہ پڑ سکا"

یہ فقرہ آغا صاحب کے اخلاق کا بھی آئینہ ہے، آغا کا اُستاد سے کمالِ محبت و کمالِ ادب اور کمالِ سخن فہمی و کمالِ انکسار دیکھیے کہ اُستاد کی اچھوتی طبیعت کا شائبہ نہ پڑنے میں اپنی ذات کو بھی شامل کر لیا، اور صداقت اور اخلاقی جرأت کے ساتھ یہ بات کہہ دی، حضرتِ داغ کے کتنے شاگرد گذر چکے اور کتنے اب موجود ہیں، شاید کوئی ایک آدھ حضرت مولانا احسن مارہروی جیسا نیک نفس، قلبِ سلیم اور ذوقِ صحیح والا ایسا ہو جو آغا شاعر کی تائید کرے، ورنہ ہر شخص کو اُستاد داغ کی جانشینی کا دعویٰ ہے۔

اس سلسلے میں آغا صاحب کے متعلق کوئی مقالہ لکھا جائے تو اس میں ان کی نثر نگاری کا بھی ذکر ضروری ہے، میرے پاس اتفاق سے اُن کی کوئی تصنیف موجود نہیں، نہ کوئی ناول، نہ افسانہ، نہ ڈراما، ان کے رسالہ آفتاب کا ایک پرچہ موجود ہے۔ اس میں آغا صاحب کا ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے، اس کا کچھ

انتخاب درج کرتا ہوں۔ جس سے آغا صاحب کی دلکش تحریر کا نمونہ بھی نظر کے سامنے آجائے گا۔ اور خود آغا صاحب اور اُن کے استاد کے بعض اخلاق و حالات پر بھی روشنی پڑے گی۔

آغا شاعر نے "آفتاب" میں ایک سلسلہ مضمون شروع کیا تھا؛ جس کا موضوع اس کے عنوان سے ظاہر ہے یعنی، "بزمِ داغ کے چشم دید نقوش" اس میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں (اُستاد مرحوم کے ارشد تلامذہ)

"استثنائے اعلیٰ حضرت (یعنی حضور نظام میر محبوب علی خاں بہادر) استاد بہادر کے ارشدِ تلامذہ اس وقت صرف انگلیوں پر گنے جاتے تھے یعنی، مولانا عبدالحی بیخود، منشی نسیم، سید وحید الدین بیخود دہلوی، بھابا رام چند عیش، برادر گرامی قدر سید احسن مارہروی، نواب عزیز یار جنگ بہادر، جناب آزاد، جناب بارق، جناب شاہی گورگانی، فیروز شاہ خاں رام پوری، اور جناب رسا مرحوم میاں نوح ناروی اُس وقت نو سبق آموز تھے، نواب سراج الدین سائل دہلوی اس وقت اتنے مقرب نہ تھے، گو بلدے ہی میں تشریف رکھتے تھے، اور معیار الانشا کے دو ایک نمبر بھی آپ کے قلم سے نکل چکے تھے، مگر اُن کے مقربِ خاص ہوتے ہی اُستاد کا وصال ہو گیا، بس اللہ اللہ خیر صلا، اس کے بعد جس قدر پیدا وار بڑھی یہ سب اُستاد کا تصرف ہے۔

آغا شاعر نے یہ ذکر ۱۹۰۲ء کا لکھا ہے، جیسا کہ اسی مضمون کے ایک اور فقرے سے معلوم ہوتا ہے، یعنی کلام پر اصلاح دیتے کے سلسلے میں مرزا داغ نے کہا ہے "اب میں بہتر برس کی عمر میں ان مصرعوں کے لئے دستِ و گریبانی کہاں سے لاؤں"

داغ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے تھے، اور اس ذکر سے دو سال بعد فروری ۱۹۰۵ء میں انتقال فرما گئے۔

یہ مسئلہ بھی، یعنی کسی اُستاد سے فیض پانا اور اس کی جانشینی کا مستحق ہونا، تاریخ شاعری کا ایک دلچسپ باب و عنوان ہے۔ کسی شاعر اور اس کی شاعری کا مطالعہ، اس پہلو سے بھی کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اسی رسالہ آفتاب بابت اکتوبر ۱۹۲۱ء کے ایک دوسرے مضمون میں منشی نسیم بھرتپوری نے آغا شاعر کی تائید ان الفاظ میں کی ہے۔

"اُستاد داغ مرحوم کے تصرفات بھی عجیب و غریب ہیں۔ ان کی زندگی میں ان کے ارشد تلامذہ کے نام انگلیوں پر گنے جاتے تھے: یادگارِ داغ، اس کی شاہد عینی موجود ہے، مگر ان کے مرتے ہی اب اُن کے نام لیوا سینکڑوں گم نام و نشان برساتی کیڑے، پیدا ہو گئے۔ جو ایسے سعید شاگرد بنے ہیں کہ بجائے تعریف کے الٹا مرحوم اُستاد کو بدنام کرتے ہیں، بعض کہتے ہیں، ہم کو خواب میں یہ سند عطا ہوئی ..... بعض مجہول الاحوال خانہ ساز ڈم دار خطابوں کے پُنچھلے لٹکا کر خود ہی اِترانے ہیں ...... ہم تو ان مرفوع القلم حضرات سے اتنا پوچھتے ہیں کہ جانشینی و عدم جانشینی ہے کیا چیز؟ کیا کسی کا جانشین کسی کے کہہ دینے سے کوئی بن سکتا ہے؟ ..... داغ صاحب کو کس نے جانشین بنایا؟ ذوق مرحوم کس کے بنائے سے خاقانیِ ہند بنے؟ اور شاہ نصیر دہلوی کو ان کے مرتبے تک آخر کس نے پہونچایا؟ حضرت! دنیا میں کمال کی قدر ہوتی ہے۔ اور کمال بغیر خدا کی دین کے میسّر نہیں آسکتا۔

ہر ذرہ شتاب دریں رہ کہ بسان تو ضعیف   صورت کرمک شب تاب ہزار آمد و رفت

یہ درمیان میں شاعرانہ اخلاق و آداب کا ایک رُخ آگیا تھا، آغا شاعر اپنے اسی مضمون، (بزمِ داغ) میں اپنے اور استاد داغ کے تعلقات شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔

استاد کا ادب اور وقار

"میں استاد کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوتا تھا جیسے غلام آقا کے سامنے، یا گنہگار حاکمِ وقت کے روبرو، لرزتا، کانپتا، تھراتا، اور کبھی بجز ضرورت کے کوئی کلمہ میری زبان سے نہ نکلتا تھا، جو کچھ پوچھنا تھا پوچھا، جو پوچھا وہ عرض کیا، باقی وقت خاموش، اور یہی حال اُن کا تھا، وہ بھی مجھے شیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، میں حاضر ہوا ہوں، کمرے میں قہقہے اُڑ رہے ہیں، اور جہاں میں نے اندر قدم رکھا، لبِ فرش پہونچ کر آداب بجالایا، اور سب سے فروتر بیٹھ گیا، وہی مقام پھر اس طرح سنسان اور خاموش تھا، جیسے وہاں کوئی ذی روح نہیں۔

میری ذاتی اصلاح

میری اصلاح کیا ہوتی تھی گویا جنگِ عظیم کا ایک الٹی میٹم ہوتا تھا، اُدھر حضار گوش بر آواز، اِدھر میں خوف سے لرزاں اور لب تشنۂ مطالب، اُدھر اُستاد کو معمول سے زیادہ کاوش مطلوب، تیوری چڑھی ہوئی ہے! ایک بھوں ماتھے تک کھنچ کر جا پہنچی ہے، اچھا بلند سے بلند شعر ہوتا تھا بگڑ بگڑ کر فرماتے آگے چلو جی، اور جہاں ذرا سا بھی سقم نظر آگیا بس برس پڑتے قیامت کردی، "یہ کیا؟ صاحب یہ کیا؟ ذرا پھر عنایت کیجیے! ماشاءاللہ، سبحان اللہ، یہ آپ نے لکھا ہے؟" غرض جان پھر لانی مشکل ہوجاتی، اس سرزنش اور معاصرین کی موجودگی کا اس درجہ خوف ہوتا تھا کہ ایک ایک مصرعے پر جان لگا دینی پڑتی تھی، جب جا کر وہ فرماتے تھے۔

آگے چلو، آگے چلو، ہاں البتہ جن مصرعوں پر مصرعہ لگانا میرے بس کا روگ نہ ہوتا۔ وہ بیٹھک میں چوں کرے جاتا، اور بعض اوقات انہیں کی اصلاح میں انہیں سخت کاوش کرنی پڑتی تھی، اور انہیں پر وہ اکثر مُنغض بھی ہو جاتے تھے، بار بار پہلو بدلتے، اِدھر تکیہ لگاؤ، اُدھر تکیہ لگاؤ، پھر پڑھو اور پھر پڑھو، کیا مصرعہ بکا ہے؟ کیا لغو بندش ہے، یہ ہمارے پاس اصلاح لینے تھوڑا ہی آتے ہیں، یہ تو ہمارا امتحان لینے ہیں صاحب باہر کے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دینے کی صورت یہ بیان کرتے ہیں۔

اصلاح کی ترکیب۔

" آپ پلنگڑی پر لیٹے ہیں یا گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں، چاروں طرف مستعد تلامذہ کا جھرمٹ ہے، اور ایک صاحب غزلوں کا نخبہ سامنے رکھے، قلم ہاتھ میں لئے ایک ایک غزل پڑھتے جاتے ہیں، حاضرین ہر شعر کو غور سے سماعت فرماتے ہیں، اور مناسب موقع پر اپنی اپنی رائے کے پرتوے لفظے بھی دیتے جاتے ہیں۔ اگر اس مشورے سے اُستاد کی رائے کو بھی اتفاق ہو گیا تو وہی الفاظ اس غزل میں بنا دیلے گئے، ورنہ جو اُستاد نے بطور خود ایما فرمایا بجنسہٖ وہ اس مقام پر جڑ دیا گیا۔ اس طرح اصلاح کی اصلاح ہو جاتی تھی اور آپس کے تبادلۂ خیالات سے معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا تھا۔"

اس مضمون کے بعض حصّے اور بھی قابلِ نقل ہیں لیکن وہ ان سے زیادہ طویل ہیں اور مضمون اب بھی کافی جگہ لے چکا ہے اس لیے ختم کرتا ہوں۔ آفتاب کے اس پرچے میں حاشیے پر آغا شاعر کے قلم کی چند سطریں لکھی ہوئی ہیں اور ان کے انگریزی میں دستخط بھی ہیں۔

منقول از نقد و نظر

مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۲ء

دلدار شاہ داتا

خواجہ حسن نظامی دہلوی

میرے دوست آغا شاعر صاحب مرحوم آج سے تیس؟ سال پہلے ایک دفعہ میرے پاس آئے تو میں نے دیکھا گیروا کرتا گلے میں ہے، سر برہنہ، قلندرانہ شان، الا اللہ کے نعرے لگاتے ہوئے، میں نے یہ ہیئت دیکھتے ہی کہا، آیئے دلدار شاہ داتا۔ وہ میرا فقرہ سُن کر پھڑک گئے اور کہا، اب اس نام سے پکارا کیجیے۔ میں نے کہا نام سے کیا ہوتا ہے، کچھ کام بھی کیجیے، میں مکان دیتا ہوں اس میں کچھ دن رہیے اور فقرا کی باطنی تعلیم حاصل کیجیے، کہا ہم تو اسی نیت سے آئے ہیں، بتایئے کون سا مکان ہے۔

میں نے ایک مکان میں اپنے قریب ٹھہرایا، تصوف کے اذکار، اشغال بتلایئے، اور روزانہ شام کے وقت چند گھنٹے ان کے ساتھ گزرنے لگے،

ایک چلّے کے بعد میں نے ان کو متھرا بھیجا، جہاں کئی مہینے اُن کا قیام رہا، جہاں میں نے پہلے سے بندوبست کر دیا تھا؛ اس کے بعد جی اکتایا اور وہ متھرا سے واپس چلے آئے، پھر کبھی ان سے اس شوق کا ذکر نہیں سُنا۔

دلدار شاہ کا حلیہ: آغا شاعر صاحب قزلباش کا قد میانہ تھا جسم دوہرا، گداز تھا، چہرہ گول، آنکھیں بڑی بڑی چمک دار اور رسیلی تھیں۔ آواز بڑی اور پاٹ دار تھی، جب شعر پڑھتے تھے تو شعر کی تصویر بن جاتے تھے، اس خوبی سے ادا کرتے تھے،

ایک دن میں نے کہا، مجھے سوائے حضرت اکبر الہ آبادی اور کسی کے اشعار یاد نہیں رہتے، بولے، کیا میرا بھی کوئی شعر یاد نہیں رہتا، میں نے کہا۔ جی ہاں آپ کا بھی کوئی شعر یاد نہیں ہے، البتہ آپ کی ایک کتاب کا ابتدائی حصّہ یاد ہے، جو نظم نہیں نثر ہے، تعجب سے پوچھا، وہ کیا عبارت ہے، میں نے وہ عبارت سنائی جو یہ تھی:

"یہ میٹھی میٹھی ٹکیاں، جو اماں نے بڑے چاؤ سے پکائی ہیں، کھا تو رہی ہوں مگر رہ رہ کر تم یاد آ رہے ہو"!

آغا دلدار شاہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور اس کتاب کا بہت دیر تک ذکر کرتے رہے، جس کی عبارت یہ تھی۔

میں ان کو دہلی کی جان کہا کرتا تھا، افسوس وہ نہ رہے، اور دہلی کی زندگی بے جان ہو گئی۔

منقول از

(منادی دلّی)

ہیرے کی کنی

شان الحق حقی دہلوی

ہیرے کی کنی حضرت آغا شاعر مرحوم کا ایک چھوٹا سا ناولٹ ہے، جسے جدید معنی میں مختصر کہانی ہی کہنا چاہیے۔ کیونکہ میرے سامنے جو اس کا پہلا ایڈیشن ہے، ارٹ ۱۸۹۹ء کا چھپا ہوا، اس کی ضخامت ۸۷ صفحات ہے اور بس۔ مگر اس کے سرورق پر اسے "ناول" ہی کہا گیا ہے، "البیلا اور جنبل ناول"

اس کے البیلا اور جنبل ہونے میں کوئی کلام نہیں، اور میں اسے بھی آغا شاعر کی سند پر مان سکتا ہوں، جب سے اردو لغت کی تدوین سے وابستگی ہے، بعض ذہنی عادات بدل گئی ہیں، لفظ کے معنی وہی ہوتے ہیں۔ جو اہلِ زبان مقرر کر دیں، مرتبین لغت کو اس میں حجت کا حق نہیں ہوتا، اب ہمارے ہاں ناول کی جو تعریف کی جائے ہیرے کی کنی کو اس میں شامل کرنا ضروری ہوگا، جیسے ڈاکٹر جانسن کا مختصر ناول "راسلیاس" بھی ایک جیبی سائز کی کہانی ہی ہے اور اس میں "ناولیت" بھی نہیں پیدا ہونے پائی۔ اسی عہد میں انگریزی میں بڑے بڑے ضخیم اور بھرپور ناول لکھے گئے، جن سے انگریزی ناول کا نام چلا، لیکن ڈاکٹر جانسن نے اسے ناول کہہ کر پیش کیا تو اب اسے ناول ہی کہا جاتا ہے۔

یہ آغا شاعر کا پہلا ناول نہیں تھا، اس سے پہلے وہ کئی ناول اور لکھ چکے تھے۔ الزورفیہ، پرستان، ارمان وغیرہ جن کا ذکر اس کے سرورق پر کیا

گیا ہے ان میں سے ایک قدرے زیادہ طویل قصہ "ارمان" میری نظر سے گزرا ہے، بلکہ میں نے بالاستیعاب اخذِ اسناد کے لیے پڑھا تھا، کہانی سے زیادہ سروکار نہیں رکھا، لیکن کہانی وہاں بھی سیدھی سپاٹ نہیں، خاصی پیچیدار تھی اور یہاں بھی خاصی "سنسنی خیز" ہے، اب یہ اور بات ہے کہ مجھے جو سنسنی محسوس ہوئی تو وہ قصے کے واقعات پر کم اور فراوانیِ لغات پر زیادہ، یہ اُن کتابوں میں سے ہے جنہیں تین تین مرتبہ کھنگالا گیا اور ہر دفعہ اس میں سے کام کے الفاظ نکلتے ہی چلے آئے، ان ۸۰ صفحات میں سے ہم نے کم وبیش ۳۵۰ الفاظ کے کارڈ بنائے ہیں۔

دراصل لغت تو ہمارے مصنفین جمع کر گئے، اب [illegible] ان کی کتابوں میں سے نکال کر ترتیب دینا رہ گیا ہے، اگر یہ تصانیف نہ ہوتیں، تو اردو زبان کب کی ہو چکی تھی، اور اب اس کی فراوانی لغات پر حیرت ہوتی ہے بلکہ افتخار محسوس ہوتا ہے، کہ ہم کو کیسی بنی بنائی اور سلجھی سلجھائی زبان ورثے میں ملی ہے، اس کو اپنے بزرگوں کا عطیہ سمجھنا چاہیے۔

آغا شاعر کے اردو پر خاص احسانات ہیں، انھوں نے اس کو نظم، نثر، تراجم، کئی ذرائع سے مالا مال کیا ہے، ان کی کوئی تحریر لطف سے خالی نہیں، یعنی الفاظ و محاورات سلاست و فصاحت کے علاوہ بھی اس میں کچھ ہے، جسے تخیل کی کارفرمائی کہتے ہیں، اور جس کے بغیر ادب کو اعتبار و وقعت حاصل نہیں ہوتی، وہ بڑے حوصلہ مند لکھنے والے تھے، ادب کے میدان میں انھوں نے کئی ہفت خواں طے کیے ہیں، رباعیات خیام اور خود ترجمہ قرآن. مگر طبیعت میں

جو لطافت تھی وہ اپنی جھلک۔ جگہ جگہ دکھا دیتی ہے۔

ادب ایک جگہ ٹھہرا نہیں رہتا، اب ہم اس دور کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ جہاں یہ ناول لکھے جاتے اور ناولوں میں شمار ہوتے تھے، لیکن اس پر ناقدانہ نظر ڈالتے وقت یہ حقیقت نظر میں رہنی چاہیے، کہ یہ ہم کو خواہ کتنی پرانی اور فرسودہ چیز نظر آئے، اپنے وقت میں بڑی جدت آفریں تھی۔! یہ داستان گوئی کی روائت سے گریز تھا، جو پہلے پہل انہی چند لکھنے والوں نے کیا، پھر سارا کاروان اس طرف مڑ گیا۔ اور بے شک اس نے کئی منزلیں [illegible] طے کریں۔

میرا [illegible]سہ یہ ہے کہ ناول کیسا ہی عمدہ سہی، میرے گلے سے بڑی مشکل سے اترتا ہے، اچھے اچھے ناول میں نے ادھورے ادھورے چھوڑ دیے، جن سے عموماً پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے، آدمی کو چاہیے کہ تاریخ پڑھا کرے اور ناول لکھا کرے، ہے یوں کہ لوگ تاریخ کو صرف لکھتے ہیں اور پیٹ ناول سے بھرتے ہیں، سچ پوچھئے تو مجھے "ہیرے کی کنی" یوں بھی پسند ہے کہ یہ بس ایک بیت الغزل کی طرح مختصر ہے، اس سے ناول پڑھنے والوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا، لیکن اس کی خصوصیت، افادیت، اور اہمیت یہی کیا کم ہے کہ ہم نے ان تحریروں سے اپنی لغت کا پیٹ خاصا بھر لیا۔

آغا شاعر کی ایک ایک تحریر اس قابل ہے کہ محفوظ کی جائے۔ اور اشاعت پائے، ان کی ذہین، طباع اور سعادت مند صلبی یادگاریں اب ان کی معنوی یادگاروں کی بقا کا حسبِ توفیق تھوڑا بہت سامان

کر رہی ہیں، یہ اس کے لیے مبارکباد اور ہمت افزائی کی مستحق ہیں، دراصل یہ کام بڑے اداروں کے کرنے کا تھا۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ "ہیرے کی کنی" کا نیا ایڈیشن چھپ رہا ہے، امید ہے کہ اس کے بعد حضرت مرحوم کی دوسری تصانیف بھی چھپ کر ناپید سے پیدا ہو جائیں گی، امید ہے کہ اردو کے بڑے اشاعتی ادارے دیر یا سویر یہ فرض ضرور ادا کریں گے

جانشینِ داغ

ریاضؔ خیرآبادی

جناب سائلؔ صاحب دہلوی کا شعر ملاحظہ فرمایئے۔

نگہ کو حکم دے چل پھر کے بازار محبت میں،
جہاں جنسِ وفا بکتی ہو وہ دوکان پیدا کر

سائلؔ کو لوگ نہ جانتے ہوں تو پہچان لیں، آپ دہلی کے سربرآوردہ رئیسوں میں ہیں اور جناب داغؔ مرحوم رحمتہ اللہ علیہ کی ایک متبنیٰ صاحبزادی کے شوہر بھی ہیں، اس وجہ سے دنیز دہلوی ہونے کی وجہ سے آپ کو جانشینیِ داغؔ کا خیال پیدا ہوا تھا: مگر قابلِ شاگردانِ داغؔ کے لڑ کنے سے آپ کا حق ساقط ہو کر آغا (صاحب) شاعرؔ کی طرف منتقل ہو گیا۔

یہ فیصلہ طلب بات ہے کہ کون شاگرد جانشینی کا مستحق ہے، اس لئے کہ کئی صاحب لائق اور صحیح جانشین ہو سکتے ہیں۔ مگر شاعری اور بول چال چنداں بری نہیں ہے، اور وہ کہتے بھی اچھا ہیں،

ڈیلیا، ایک انگریزی پھول ہے، یہ خوبصورت ہوتا ہے، اس کی رنگین ادائی کی تعریف "مخزن" میں آغا شاعرؔ صاحب (دہلوی) نے کی ہے، گو شاعری کے اعتبار سے نظم کیسی ہی ہو، مگر پھول کی تصویر خوب کھینچی ہے، اپنے دوستوں کے لئے ہم درج کرتے ہیں۔

اک نیا پھول ڈیلیا دیکھا　　صدقے اُترے ہزاروں لالہ
لبِ معشوق پنکھڑی پہ فدا　　خانے خانے میں جس کے شہد بھرا
اللہ اللہ عجیب گُل پھولا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

پھولی پتیاں دو چند سہ چند　　شاخ در شاخ نت نئے پیوند
اوس کے موتیوں سے دولتمند　　کیا شگوفے ہیں کچھ کھلے کچھ بند
بھا گئی تیری ایک ایک ادا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

زرد، آبی، گلابی، سرخ و سفید　　مٹھیاں بند ہیں، کھلے کیا بھید
پتیاں خول، ننھے ننھے چھید　　شہد کوزے میں، مکھیوں کو نوید
میں بھی لب بستہ ہوں کہوں گا کیا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

رستہ چلتے جو سر اٹھاتے ہیں　　کیسے گچھے سے لہلہاتے ہیں
آنکھ پڑتے ہی مسکراتے ہیں　　تو اشاروں سے یہ بلاتے ہیں
اپنے ہم جنسوں کی دکھا کے ادا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

دیکھے جو، وہ دیکھتا ہی رہے　　یہ ہری ٹہنیاں، ہرے پتے
سرخیوں میں سفیدیاں ہے ہے　　سب سے اونچی چٹان پر قبضے
اس پہ رہ رہ کے جھرمنا تیرا
ڈیلیا تو نے دل کو لے ہی لیا

جھٹ پٹا وقت، یہ بلند مقام — دُھر باد ھایا سا چرخِ نیلی فام
بادل اڑتے ہوئے ہوا پہ، تمام — ان کے سائے میں لسے کمن اندام
مجھ کو خود رفتہ کر دیا گویا
ڈیلیا، تو نے دل کو لے ہی لیا

تجھ کو دیکھوں، جو تو اجازت دے — تجھ کو چاہوں، جو تو اجازت دے
تجھ کو سونگھوں، جو تو اجازت دے — پیار کر لوں، جو تو اجازت دے
ڈر یہ ہے، ہو وہ وقت نہ جلد
ڈیلیا، تو نے دل کو لے ہی لیا

جتنے معشوق ہیں، انہیں اعجاز — ظلم و جور و جفا و سوز و گداز
جانِ عاشق کے واسطے سُتناز — تُو سراپا کرم، غریب نواز
تجھ سے نسبت بھلا کسی کو کیا
ڈیلیا، تو نے دل کو لے ہی لیا

رنگِ رُخ کیوں نہ ہوگا اور بہے — اوکسیجن کا ہر طرف ہے دور
دمِ عیسیٰ نفس، نفس کا طور — مردہ آئے تو جی اُٹھے فی الفور
مایۂ زیست ہے یہاں کی ہوا
ڈیلیا، تو نے دل کو لے ہی لیا

ہائے فرصت نہ دی زمانے نے
جان لے لی ہے آنے جانے نے
پھر اُڑایا کسی نشانے نے
پھر کشش کی ہے آب ودانے نے
اُٹھ کے شاعر چلا یہ کہتا ہوا
ڈیلیا، تو نے دل کوئے ہی لیا

منقول از
(انتخاب "فتنہ")

دلّی کا زباں داں

پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی

سحر ہے، افسوں ہے، جادو ہے، تری تحریر میں
داد دینے کو ہوئی جنبش، لبِ تصویر میں
لکھ چکی کلکِ ازل، شاعر تری تقدیر میں
ٹھیٹھ ٹکسالی زباں، تجھ کو ملے جاگیر میں
زار اور دلّی رہے نازاں ترے اعجاز پر
گوئے سبقت لے گیا تو بلبلِ شیراز پر

طوطیِ طلسم اللساں، جادو مقال، سحر بیان، ناظمِ نظم دلپذیر، ناثرِ عدیم النظیر، سخنورِ شیوا بیاں، نغز گوئے فرید الزماں، افسوں طرازِ دوراں، علم بردارِ تہذیب و تمدنِ مشرقی، آغا ظفر علی بیگ قزلباش شاعر دہلوی، زمانۂ متاخرین کی اُن معدودے چند ہستیوں میں سے تھے، جن پر دلّی اور اہلِ دلّی ہمیشہ فخر کرتے رہے اور کریں گے۔

قدرت نے انہیں وہ ملکۂ خداداد ودیعت کیا تھا، جس کی وجہ سے آپ دنیائے شاعری میں نہایت نامور ہوئے اور ان کی یہ بجا شہرت ہمیشہ قائم رہے گی، یہاں کے مشاہیر کی صفِ اولین کے حضرات میں ان کا شمار ہوتا تھا اور فی الحقیقت وہ اس کے مستحق اور درخور بھی تھے۔

یہ ہمیشہ دلّی کی ٹکسالی زبان برتتے اور فصیح روزمرہ اور چیدہ و برجستہ

محاورات استعمال کرتے تھے، شروع سے ہی شوخ طبیعت پائی تھی۔ مرزا شجاع الدین خاں صاحب تاباںؔ کی سخن طرازی اور نواب احمد سعید خاں صاحب طالبؔ کی جوہر شناس سخن نوازی سونے پر سہاگے کا کام دے گئی، چنانچہ اس ہلالِ آسمانِ شاعری نے دیکھتے ہی دیکھتے بدرِ کامل کی تابانی دکھانی شروع کر دی، رنگین طبیعت اور وقت کی مساعدت اور عام مقبولیت نے ان کی طبع موزوں کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔

معتد بہ عرصے تک دلّی کے مشاعروں میں اپنی جگہ گاڑھی اور شیوا بیانی کی داد لیتے رہے، مگر اس ترقی پسند چلبلی طبیعت کو اور اوپر اڑے بغیر کہاں چین آ سکتا تھا، دل میں اوج و عروج کے ارمان، جوق در جوق اس طرح جوش زن تھے جس طرح بوقلموں تخیلات ذہنِ رسا میں تلاطم فگن چنانچہ حضرت استادِ فن در درِ حاضری نواب فصیح الملک داغؔ دہلوی سے سلسلۂ مشورت سخن جاری ہوا۔ اور فیضِ تلمذ بلبل ہندوستان جہاں استاد سے یہ اخترِ رخشاں سپہر شاعری پر شمس الضحیٰ بن کر چمکا۔

ابتدا میں طبع کی روانی اور پرگوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں تین تین سو، چار چار سو اشعار کہتے اور اپنے تلامذہ کو مشاعروں میں پڑھنے کے لئے تقسیم کر دیتے تھے، انہوں نے ابتدائے سخن سنجی میں ہی اپنی استادی کا ڈنکا بجا دیا اور اپنا جھنڈا نصب کر دیا، ان کے اس دعوے کی تسلیم کرنے والی ایک جماعت کثیر تھی، بلکہ یارانِ شاطر نے رفتہ رفتہ ان کی غزلیات کو جماعتِ حسن فروشاں کے بالاخانوں تک پہونچا دیا، جن رشکِ افلاک، ضیا فروز بلندیوں سے بہ طبقۂ عیش خصلت، پری

رو پرست پر بذریعہ موسیقی ابرِ گوہر بار کی طرح نازل اور جابجا محفل در محفل خلد سماع ہونے لگیں اور دل ربائی بہجت فروزی اور دل آویزی عشرت اندوزی سے جلوہ پیرائے دیار و امصار ہونی شروع ہو گئیں۔

اساتذۂ وقت یعنی مولانا ئے حالی، میاں ظہیر، میر مجروح، مرزا طالب جناب ثاقب، حضرت راسخ اصاحب، عالم ارشد گورگانی وغیرہ ان کی قابلیت، ان کی ذہانت، ان کی ذکاوت، ان کی فصاحت، ان کی سلاست، ان کی روانیٔ طبیعت کا اعتراف فرمایا کرتے تھے۔ اور بہ نظرِ حوصلہ افزائی ان کے کلام کو سراہتے تھے۔ ان کی سہل بیانی کی قدرت اور ان کے اندازِ ادا کی ندرت، مضامین کی شوخی، بندش کی چستی مل ملا کر ان کے کلام کا مزہ چہار چند کر دیتی تھیں، مشاعروں میں اُن کا اسلوبِ غزل خوانی سب سے بعید اور قابلِ شنید ہوتا تھا، بے تعداد اہل وطن اُن کے کلام کو سننے کے لیے دُور دُور سے آتے اور دیر دیر تک زحمتیں اٹھا کر مشاعروں میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنتِ مغلیہ کے نہالِ عروج و اقبال کو نامساعدت بخت کی دیمک چاٹ چکی تھی، دلّی سے دلّی والوں کے جلا وطن اور اکثر امرائے شرفا کے برباد اور غریب الدیار ہو جانے کی وجہ سے ایسی باکمال ہستیوں کی بسر اوقات کا کوئی سلسلہ شہر میں بہم نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ انہیں بھی ہجرت کرنی پڑی اور چندے زندہ دلانِ پنجاب کے دامنِ عاطفت میں پناہ لی یعنی اخبار "وکیل" امرتسر سے آپ کا تعلق جاری ہوا، مگر یہ سلسلہ "موئے آتش دیدہ یہ حلقہ مری زنجیر کا" ثابت ہوا، اور اخبار نویسی اور مضمون نگاری کی دنیا اس

کا بِن فن کی سحر کاری اور گوہر باری سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

امرتسر سے یہ لاہور پہونچے، اور گو لاہور کے رئیس اعظم نواب فتح علی خاں قزلباش بھی التفات فرماتے رہے، مگر ان کے ندیمانِ حاسد نے ان کا نقشہ نہ جمنے دیا اور چند روز ملک التجار حاجی شیخ رحیم بخش صاحب آنریری مجسٹریٹ لاہور کے صاحبزادے مکرمی و ملاذی شیخ محمد رفیع صاحب اختر دہلوی کے مہمان رہ کر وطن کی طرف مراجعت فرمائی۔

دلی واپس پہونچنے کے قلیل عرصے کے بعد آپ پھر تلاش میں وطن سے نکلے، چونکہ لکھنؤ اب وہ لکھنؤ نہیں رہا تھا، جہاں ہر پریشان حال مومن مسلمان یا تباہ روزگار صاحبِ ایمان جا پہونچتا اور وزیر الممالک نواب آصف الدولہ کے باقیات الصالحات ذی کمالوں کی قدر دانی کو مغتنمات بلکہ اکثر تلافی مافات سمجھ کر ہر ایک کے ساتھ اخلاق و دریا دلی سے پیش آیا کرتے تھے، اس لیے یہ حیدر آباد دکن پہونچے، جہاں ان دنوں ان کے اور راقم الحروف کے اُستاد ذی شان نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا آفتاب عروج مرتبت نصف النہار فلک اوجِ ادب پر درخشاں اور تاباں تھا، اور استاد سلطانِ دکن ہونے کی وجہ سے مینارِ رفعت و عظمت کا کنگرہ جبر افگار سپہرِ کرامت تھا، استاد کی نگاہِ لطف اور اُن کی آتش بیانی، ان کی دشمنِ جانی ہو گئیں۔ چنانچہ بہت سے کوتاہ نظر اور بے بصر حسّاد نے چاہا کہ انہیں اپنے رعب فضلیت و مشیخت علمیت سے نیچا دکھائیں یا دبائیں، مگر حضرتِ شاعر کی طبع کی روانی فصیح بیانی، اسلوب ادا اور رحمت کبریا علی الدوام ان کے گاڑھے میں آڑے آئیں اور ان کا وقارِ

منزلت ہمیشہ برقرار اور بدستور رہا اور ان کے مخالفین کو علے النواتر ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ ان بے لطیفوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ یمین السلطنت مہاراج کشن پرشاد بہادر کی سرکار میں جا پہنچے، مگر ان کے اخترِ نحس نے انہیں وہاں بھی چین سے نہ رہنے دیا، حد درجے کے خود دار اور پرلے سرے کے نازک مزاج تھے۔ چنانچہ پنجاب کی طرح سے دکن سے بھی ہیک بینی و دوگوش واپس آئے۔

شباب کا زمانہ۔ دل بے چین، طبیعت عشق آشنا، تخیلات شورش زا، کلکتے جا پہونچے، اور مربیانِ ناٹک تک رسائی پاکر اُن کی استدعا پر ڈرامہ نگاری اختیار کی اور بسہولت بسر اوقات ہونے لگی، بعد کو بیگم صاحبہ مرشد آباد کے داماد نواب نصیر الممالک سفیر ایران کی مصاحبت میں رہے۔ اور اسی سرکار سے انہیں "افسر الشعرا" کا خطاب ملا۔ آخر ان کی غیور اور حساس طبیعت نے پنجاب اور دکن کی طرح سے انہیں بنگال میں بھی چین سے نہ رہنے دیا۔

جانشینیٔ اُستاد خلد آشیانی کے متعلق بڑی کج بحثیاں اور بے لطفیاں ہو چکی ہیں، گو اس میں شک نہیں کہ اُستاد کے ریاضِ تلامذہ میں گوناگوں رنگوں اور بوقلموں نکہتوں کے گل وریاحین، بہارستانِ ادب اور چمنستانِ سخن میں آنکھوں کو مسرور اور مشاموں کو معطر کر رہے تھے اور ان سب کی قابلیت، مرتبت، عظمت اور جدت کو زمانہ مان چکا ہے اور مانتا رہے گا۔ تاہم اُستاد مرحوم اپنا رنگ اور اپنی مرصع کاری اور گل افشانی کے خود ہی موجد اور خود ہی مختتم تھے، پھر بھی میں بے خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ کوئی "پیر بھائی" "شاعر مرحوم" کو اپنے برابر کا اُستاد مانے یا نہ مانے مگر اس سے منکر نہیں ہو سکتا کہ طبع کی

روانی، تغزل کی شان، روزمرہ کی دلاویزی، اسلوبِ ادا کی دلفریبی اور محاورات اور ٹھیٹھ دلی کی زبان کا استعمالِ بے تکلف وغیرہ جو استاد کے کلامِ پاک کا عنصرِ اعظم ہیں، وہ آغا شاعر کے کلام فصاحت التیام میں بدرجہ غایت موجود ہیں۔

آغا صاحب مرحوم کئی کتابیں تصنیف فرما گئے ہیں، یہ فسانہ نگارِ یگانہ اور ادیبِ منتخب الزمانہ اخلاق میں وحید الدیار، علمِ مجلسی میں فریدِ روزگار، آزادی کے حامی، نقیضِ بین الاقوامی کے دشمن اور اتحادِ ابنائے ملکی کے ساعی تھے، چنانچہ اخبارات تیغ و تن دلی اس کے شاہد ہیں۔ انہوں نے ریاست جھالاواڑ سے ایک رسالہ اجرا فرمایا تھا جو آفتاب کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا، آپ مہاراجہ صاحب بہادر جھالاواڑ کے درباری شاعر قریباً قریباً دس سال رہے، فصیح اردو میں کلامِ مجید کا منظوم ترجمہ کیا نیز رباعیاتِ عمر خیام کا عقیدتاً شیعہ تھے۔ اور مرثیے کہتے بھی تھے اور پڑھتے بھی تھے، ریاست خیرپور میں انہیں کئی مرتبہ مجالسِ عزا میں مرثیہ خوانی کے لئے بلایا گیا، ان کا پہلا دیوان تیر و نشتر ان کی حیات میں شائع ہو چکا تھا اور بہت سا کلام غیر مطبوعہ پڑا ہے۔

حضرت شاعر مرحوم کے شاگردوں کی تعداد کئی سو تک پہونچتی ہے، اُن کے پاس کئی رجسٹر موجود تھے جن میں ان کے تلامذہ کے نام اور پتے باقاعدہ درج ہوتے تھے بہرحال ان میں ہر مذاق اور ہر طبقے کے لوگ تھے۔ جن میں سے مفصلہ ذیل نامی شاگردوں کے نام میرے فرسودہ ذہن میں اب تک موجود ہیں۔ شمس۔ خالی، مائل، برقی، اختر، ہاشم، نسیم، شوق، احسان، وغیرہ۔

چمنستان دلی
مارچ ۱۹۴۰ء

شورِ انگیز ہستی

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی

رہ گذرِ عمرِ رواں کا ہے عجب ناہموار
کبھی دیکھی ہے بلندی، کبھی پستی دیکھی

اس عنوان کی ایک تمثیل میرے ایک عنایت فرما آغا ظفر علی خاں صاحب قزلباش مرحوم موسوم بہ آغا شاعر کی ہستی تھی، جو اب نظر سے غائب ہو کر جوارِ رحمتِ الٰہی میں آسودہ ہے۔ یہ ایک شورِ انگیز ہستی تھی جس نے دنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ جناب نواب مرزا خاں داغ دہلوی فصیح الملک کے تلامذہ میں آپ بھی ایک بلند پایہ حیثیت سے ممتاز تھے اور میرے خیالِ ناقص میں جناب فصیح الملک کے نامی گرامی شاگردوں میں سے صرف آغا صاحب کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ طرزِ غزل خوانی اور ادائے بیان میں، جو عوام کے قلوب پر اثر انداز ہوتا ہے، آپ کو اپنے استاد کے فیضِ تربیت سے زیادہ حصہ ملا ہے۔ میری معلومات کی بموجب آپ ... سب سے کم عمر شاگردانِ نواب مرزا صاحب میں سے ایک تھے۔ زبان کی سادگی اور کلام کی شوخی، استادی کی اوصافِ خصوصی سے آغا صاحب کے حصے میں زیادہ تر آئے ہیں۔ ایک امر خاص طور پر اظہار کے قابل یہ ہے کہ آغا صاحب کے اخلاقی ہمت و جرأت بمقابلہ دیگر تلامذۂ کرام کے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ کسی شاگرد کا حوصلہ نہ تھا کہ استاد کی اصلاح پر لبِ گستاخی کر سکے۔ یا رد و قدح درمیان لا سکے، مگر آغا صاحب مرحوم اس سے مستثنیٰ تھے اور اکثر مواقع

پر آپ اصلاحات پر کچھ بحثتی کر بیٹھتے تھے۔ اور جب تک اطمینان نہ ہو جاتا تھا، بحث سے باز نہ آتے تھے، یہ استادی اور شاگردی کے ابتدائی زمانے کے راز و نیاز ہیں۔

آغا صاحب مرحوم کا لبعد کا زمانہ ایک عروج کا زمانہ تھا، جس کو عہدِ زریں کہہ سکتے ہیں، اس عرصے میں آپ نے پیاری سادہ کلامی سے قلوب کی تسخیر میں خاص ملکہ حاصل کیا، اور خوبی کلام کی داد پائی، ممتاز عہدوں پر ریاستوں میں اوقات گذاری ہوتی رہی، مگر شوخیِ طبع نے کہیں استقلال کی صورت اختیار کرنے نہ دی، یہ عہد آغا صاحب کا خوش وقتی سے گذرا اور آپ نے اپنے کلام کی بدولت اطرافِ ہند میں اچھی شہرت حاصل کی، مگر آخر عمر کا حصہ اس قدر سعید ثابت نہ ہو سکا کہ کمال اطمینان سے اوقات گذار کر سکیں ابتدائے عمر سے جو مشغلہ لاحق ہوا تھا وہ دمِ آخر تک قائم رہا، گو صورت حال میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، صحت، قوا، دماغ اور حافظہ کہاں تک ساتھ دے سکتے اور امداد کر سکتے تھے۔

آغا صاحب کے کلام کے محاسن دنیائے ادب کے اس مجموعے سے نمایاں طور پر روشن ہوں گے جو مسودات کی صورت میں ہے اور جلد از شائع ہونا چاہیئے۔ آپ کے تلامذہ میں چند روشن مثالیں موجود ہیں اور چند نظر سے پنہاں ہو گئیں، دائرہ تلامذہ کا بہت وسیع تھا، آپ کے کلام کی سادگی شستگی قریب الفہمی، شوخی، معاملہ بندی اور ادائیگی ایک مستقل یادگار ادب اردو میں ہمیشگی کے ساتھ نمونے کے طور پر قائم رہیں گے۔ ملاحظہ ہو غزل مندرجہ تحت (مشتے نمونہ از خروارے)

جان دیتے ہی بنی، عشق کے دیوانے سے
شمع کا حال نہ دیکھا گیا پروانے سے

آتشِ عشق سے جل جل گئے پروانے سے
پہلے یہ آگ لگی، کعبہ و بت خانے سے

دل جب آتا ہے تو آندھی کی طرح آتا ہے
ہوش میں آؤ، اُلجھتے نہیں دیوانے سے

غمِ دشمن میں، تبسم کہاں اُن ہونٹوں پر
سُست گئی ہے یہ کلی اور بھی مرجھانے سے

ساقیا، گریۂ غم سے مجھے مجبور سمجھ
خون رستا ہے یہ ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

رات کی بات چمن میں ہے نمودِ شبنم
صبح ہوتے ہی بکھر جائیں گے سب دانے سے

دمِ آخر، تری آنکھوں کی بلائیں لے لوں
اور دم بھر جو نہ چھلکے مرے پیمانے سے

ہائے کیا چیز تھیں وہ مست نگاہیں شاعر
جھومتا جھامتا نکلا ہوں پری خانے سے

جو خصوصیت جناب آغا صاحب مرحوم کو راقم الحروف کے ساتھ تھی اور عمر بھر رہی اس کے بیان کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔

آہ امروز انہ ورق گردانی رنگ ظہور
نسخۂ اسرار اُلفت معنیٔ نایاب شد

درکنار دیدہ شوخی داشت غلطاں گوہرے
ناگہاں چوں اشک از مژگاں چکید و آب شد

منقول از چمنستان مارچ ۱۹۴۱ء

پیر و مرشد

عبدالمجید سالک

میں نے سب سے پہلے حضرت افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش مرحوم و مغفور کو اس زمانے میں دیکھا جب اُن کا عالمِ شباب تھا، سُرخ و سفید رنگ، بلند قامت بڑی بڑی آنکھوں میں لال لال ڈورے پڑے ہوئے، خوبصورت مونچھیں، جامہ زیبِ جسم، سر پر مندیل بندھی ہوئی، نواب فتح علی خاں قزلباش مرحوم کی استدعا و فرمائش پر مبارک حویلی لاہور کی مجلسِ عزا میں تشریف لائے، لوگوں کو خبر ہوئی تو اک ہجومِ غفیر ٹوٹ پڑا، حویلی میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی، تحت اللفظ پڑھنے میں کم از کم میں نے ہندوستان بھر میں آغا صاحب مرحوم سے بہتر کوئی شاعر نہیں پایا وجاہت، ظاہری، خلوصِ باطنی، گرجدار آواز، زبان پر قدرت، اس موقع پر مرحوم نے صرف ایک سلام پڑھا۔ لیکن اُس کی گونج آج تک بھی کانوں میں باقی ہے، باوجود ضعفِ حافظہ بعض اشعار آج بھی مجھے اب تک یاد ہیں، حالانکہ اس واقعہ کو کم و بیش بتیس برس گزر چکے ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔

عروجِ کفر ٹکرانے لگا جب آسمانوں سے\
پھر پرے توڑ ڈالے دستِ حیدر نے نشانوں سے\
خدا کے خاص بندے تھے علیؑ و حمزہؓ و جعفرؓ\
بتوں کے کان بہرے ہوگئے جن کی اذانوں سے

اور کیا دلفریب اور برجستہ مقطع ہوا ہے کہ

نہ نکلا ایک بھی مصرعہ کوئی بَرجستہ اے شاکر
مری مجبوریاں کچھ کہہ رہی ہیں نکتہ دانوں سے

آغا صاحب کچھ مدت کے لئے لاہور سے غائب ہو گئے "اور پھر خدا جانے کہاں سے ہوتے ہوتے ایک دو سال کے بعد پھر لاہور تشریف لے آئے، اس زمانے میں آپ انارکلی بازار میں جہاں اب مجلہ شو کمپنی کی دکان ہے اُس بالاخانے میں مقیم تھے، میں وہیں تقریب زیارت کے لئے حاضر ہُوا، کچھ حضرات اور بھی بیٹھے تھے، مجھے نیا آدمی سمجھ کر آغا صاحب نے توجہ فرمائی تو میں نے عرض کیا "حضرت میں تو آپ کا شاگرد ہوں کیونکہ میں رسا رام پوری سے اصلاح لیا کرتا تھا، آغا صاحب مسکرانے لگے۔ اور بڑے لطف و محبت سے پیش آئے اور فرمایا۔ ہاں میاں میں نے تو پہلے ہی تمہاری نشست و برخاست سے سمجھ لیا تھا کہ اپنے ہی خاندان کے ہو۔

اس دن کے بعد میں اکثر حاضر ہونے لگا، کبھی اپنا تازہ کلام سناتے اور کبھی نہایت اصرار سے میرا کلام سنتے، جب میں کوئی نئے فیشن کی قومی نظم سناتا تو داد تو ضرور دیتے، لیکن دبی زبان سے یہ بھی ارشاد فرما دیتے کہ میاں کہتے تو خوب ہو لیکن اس تو اتنی اضافت سے ہمارا تو جی الجھتا ہے، کوئی زبان کی چیز سناؤ، پھر میں اس قسم کی کوئی غزل پیش کر دیتا،

زخمی نگہِ یار کا، دل بھی ہے جگر بھی ۔۔۔ یہ تیر عجب ہے کہ اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
کچھ شک نہیں، کعبے سے بڑا رتبہ ہے دل کا ۔۔۔ یہ منزلِ جاناں بھی ہے اللہ کا گھر بھی
وہ آئے جو سالک تو تری نزع نے کی دیر ۔۔۔ گھبرا کے نہ اُٹھ جائیں، خدا کے لئے مر بھی

ایسے زبان کے اشعار سنتے تو اُچھل اُچھل پڑتے، بے اختیار گلے لگا لیتے اور کہتے کہ

اگر اسی رنگ میں کہتے رہے تو ایک دن شمالی ہند کے "فصیح الملک" بن جاؤ گے۔ ہاں میاں ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔

جب آغا صاحب نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ شروع کیا، تو اس کی کتابت و طباعت کی دوڑ دھوپ میں میں بھی شامل تھا، پہلا پارہ چھپ کر تیار ہوا تو آغا صاحب نے اخباروں کے علاوہ بعض علما و مشاہیر ادب کے پاس بھی بغرضِ اظہارِ رائے بھیجا، ہر طرف سے تعریف و تحسین کے دو نگڑے برس گئے، ایک دن میں حاضر ہوا تو کسی قدر افسردہ سے بیٹھے تھے، میں نے پوچھا "حضرت، مزاج کیسا ہے" آج تو کچھ انقباض سا معلوم ہوتا ہے" صندوقچی پاس پڑی تھی، اس کو کھولا، ایک خط نکال کر میرے آگے رکھ دیا، اور فرمایا "سالک صاحب ذرا یہ سخن فہمی عالم بالا بھی ملاحظہ ہو۔ میں نے دیکھا تو مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم کا خط تھا، لکھا تھا، کہ "حضرت آغا تسلیم! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے کلام اللہ کو نظم کر دیا، اب کوئی اللہ کا بندہ اسے طبلے اور سارنگی پر گا بھی دے، تو مزا آ جائے"! میں پڑھ کر بے اختیار ہنس دیا، آغا صاحب نے میری طرف تیز نظروں سے دیکھا، میں نے فوراً عرض کیا "حضرت، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اکبر صاحب کو قرآن مجید کا ترجمہ نظم میں کرنے سے اختلاف ہو گا، جیسے دوسرے صدہا لوگوں کو ہے، اور ان کی طبیعت میں ظرافت ہے، اس لئے از راہِ بے تکلفی انہوں نے آپ کو یہ خط لکھ دیا، اس پر منقبض ہونے کی کیا ضرورت ہے"! فرمانے لگے "جب کسی سخن فہم کی طرف سے ایسی حرکت سرزد ہو تو رنج ہوتا ہے۔

میں نے گذارش کی کہ "جب سر سید احمد خاں نے "آئین اکبری" کو ایڈٹ کر کے شائع کیا، تو ملک بھر کے علمی حلقوں میں اُن کے اس علمی و تاریخی کارنامے کی تحسین کی

گئی، لیکن سرسید کی استدعائے تقریظ پر مرزا غالب مرحوم نے ایک ایسی نظم لکھی جس میں سرسید کے اس کام کو فضول و بیکار بتایا اور وہ نظم کلیات غالب" میں موجود ہے، پھر کیا مرزا غالب کے اس رد دینے سے سرسید کی شان یا اُن کے علمی کارنامے میں کوئی فرق آگیا،

غرض آدھ گھنٹے کی گفتگو کے بعد کہیں جاکر آغا صاحب کا انقباض دور ہوا، اور پھر اسی طرح چہکنے اور چہچہانے لگے، جیسے ان کی محفل آرا شخصیت کا شیوہ تھا،

ایک اور دلچسپ واقعہ سنئے، غالباً ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے، کپورتھلہ کی بزم سخن کا سالانہ مشاعرہ ہونے والا تھا، مولوی ظفر حسین اشک بی اے جو آج کل سلطان پور لودھی میں تحصیلدار ہیں، سکرٹری بزم سخن کی حیثیت سے شعراء کو دعوت دینے لاہور آئے، میں، حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر، یاس عظیم آبادی، ساغر، سیماب، فہیم چغتائی اور حضرت آغا شاعر مرحوم کپورتھلے پہنچے، رستے میں بھی اور وہاں پہنچ کر بھی خوب خوب لطیفہ بازیاں اور سخن طرازیاں ہوتی رہیں۔ مشاعرے کا شبنیہ اجلاس بہت زیادہ کامیاب رہا دوسرے دن قبل دوپہر دوسرا اجلاس منعقد ہوا، سب شعراء نے اپنا کلام سنایا، اس کے بعد بزم سخن کی طرف سے اعلان ہوا کہ اس مشاعرے کی بہترین نظم پر ایک تمغہ دینا منظور کیا گیا تھا، چنانچہ وہ حضرت حفیظ جالندھری کو دیا جاتا ہے۔ حضرت حفیظ جالندھری باوجود اپنے کمال اور شہرت کے اپنے آپ کو میرا شاگرد بتایا کرتے ہیں، حالانکہ ایک آدھ دفعہ مشورۂ سخن کے سوا میرے ان کے درمیان ایسا کوئی واسطہ نہیں، یہ محض ان کی شرافت اور دوست نوازی ہے، انہوں نے وہ تمغہ لاکر میرے آگے رکھ دیا، اور کہا یہ سب آپ کی جوتیوں کے طفیل سے ہے، اتنے میں ہم نے کیا دیکھا کہ عظیم آباد،

آگرہ، گوالیار وغیرہ کے شعراء بطورِ احتجاج مشاعرے سے اٹھ کر چل دیئے، اور جاتے جاتے کہہ گئے کہ بڑے بڑے شعراء کی موجودگی میں حفیظؔ کو تمغہ دینا ہماری توہین ہے! حفیظؔ صاحب نے مجھ سے کہا " دیکھئے سالک صاحب یہ کس قدر تنگ دل لوگ ہیں اور سب سے زیادہ تعجب حضرت آغا شاعرؔ پر ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئے ہیں"

آغا صاحب کا نام سن کر میں تو بھونچکا سا رہ گیا، اور فوراً اٹھ کر باہر نکلا، دوسرے حضرات تو دور جاتے ہوئے دکھائی دیئے لیکن آغا صاحب ابھی برآمدے سے باہر نکلے ہی تھے، کہ میں نے لپک کے ان کو جالیا، دیکھا، کہ ان کی طبیعت میں برہمی تو نہ تھی، لیکن بس چلے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا " پیر و مرشد " تمغے مبتدیوں اور بچوں کو دیئے جاتے ہیں، بزرگوں کو تمغوں کی کیا ضرورت ہے، ان کا کمال ہی ان کے لئے بہترین تمغائے عزت ہے، اس کے علاوہ آپ یہ تو ملاحظہ فرمایئے، کہ میں آپ کا شاگرد ہوں، اور حفیظ (کم از کم بقول خود) میرا شاگرد ہے، گویا آپ کے " پوتے شاگرد " کو تمغہ ملا ہے، تو کیا یہ آپ کے لئے انتہائی مسرت کا باعث نہیں ہے۔ یہ سن کر چونکے، کہنے لگے " استغفراللہ " اس بات کا مجھے خیال بھی نہیں آیا تھا، میں تو یونہی ان لوگوں کے ساتھ ان کے کہنے پر اٹھ کر چلا آیا، میں نے کہا تو اندر چلئے، حفیظؔ کو شاباش دیجئے " اور مشاعرے میں تشریف رکھئے، یہ سن کر میرے ساتھ ہی واپس ہال میں آئے، حفیظؔ کو گلے لگایا اور بیٹھ گئے۔ ہائے کیا مخلص و شفیق ہستیاں تھیں، جو دنیا سے ناپید ہو گئیں، اور اپنی خوشیاں اپنے ساتھ لے گئیں۔

(چمنستان جنوری ۱۹۵۶ء)

افسر الشعراء نواب سائل دہلوی

بزرگوں کی دعائیں، دوستوں کی دعائیں، کسی کی درازیٔ عمر کے متعلق مقبول ہو جاتی ہیں، تو جس کے حق میں وہ دعائیں ہوتی ہیں، ایک اعتبار سے وہ مصیبت ہو جاتی ہیں، عزیزوں، رفیقوں کی موت اُس کو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بیسوں پریشانیاں، اپنے بچوں اور دوستوں کی پریشانیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اوروں کے فسانے نظر انداز کر کے میں اپنا ہی قصہ بیان کرتا ہوں، میری عمر اس وقت اسی برس کی ہے، اس مدت میں بزرگوں کے علاوہ برابر والوں اور دوستوں اور خوردوں کے مفارقت دائمی کے ایسے ایسے الم اٹھائے ہیں، جن سے دل مجروح ہے اور آنکھوں کی بصارت سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں، میرے حقیقی تین بھائی ایک بہن میرے سامنے پیوندِ خاک ہو گئے، بزرگوں کے علاوہ میرے ایسے ایسے عزیز اور دوست ملکِ عدم کو سدھارے جن کے آنکھوں سے اوجھل ہو جانے سے زندگی بے لطف ہو گئی، غمخوار، ہم مذاق اِکا دُکا رہ گئے، وہ دوست، وہ اربابِ کمال، وہ اصحابِ ادب چل بسے، جن کی یاد سے میں بھی نہیں میرے ہم وطن قدر شناس اصحاب اُن کی خوبیوں کی حکائتیں بیان کر کے اظہارِ رنج کرتے ہیں۔

اس تمہید کا مقصد مختصراً یہ ہے کہ آغا شاعرؔ دلی کی دنیائے ادب کا روشن چراغ، قبر کے اندھیرے میں جا پڑا، جو دلی نژاد ہونے پر اس زمانے میں اُس مسند پر بیٹھا تھا جس پہ

دلّی کے ادیب بیخودؔ تھے، جس نے اپنی سخنوری کا ڈنکا دور دور بجایا اور اپنے ایک ایرانی قدر دان اور باوقار ہستی سے افصل الشعراء کا خطاب لے کر مشہورِ دیار و امصار ہوا، بڑے بڑے معرکۃ الآرا مشاعروں میں دادِ سخنوری حاصل کی، آج اُس کا بیٹا پھر مجھے اس کی وفات پر رلانے آیا، اور خواہشمند ہوا کہ میں اُس کی مفارقتِ دائمی کے الم پیا اور اس کے محاسنِ ادب پر قلم اٹھاؤں، یہ انہیں بزرگوں کی دعا قبول ہو جانے کا ہونا ہے، وہ مرحوم مجھ سے بہت چھوٹا تھا، اُس کا مذاقِ سخن ایسا لطیف تھا کہ قدر دانِ ادب کا دل جانتا ہے، اصنافِ سخن میں کہیں بند نہیں تھا، وہ ادا نگاری میں مقبولِ معاصرین تھا، مجھ میں ضعفِ عوارض سے اتنی توانائی نہیں کہ میں اس کی شوخ طبعی اور مذاقِ سخن وری کو اس کے شایانِ شان قلمبند کر سکوں

چمنستان دلّی
مارچ ؁۴۱ء

طرزِ خاص کا موجد

پنڈت سدرشن

آپ کا اصلی نام تو کچھ اور ہے لیکن عوام میں آغا شاعر کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ عمر قریباً ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے، آپ فصیح الملک جناب مرزا داغ دہلوی کے قدیم شاگردوں میں سے ہیں، آپ کی غزلوں کا دیوان الموسوم بہ "تیر و نشتر" شائع ہو کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ آپ زمانۂ حال کے نامی گرامی قادر الکلام استادوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور آج کل مہاراجہ جھالرا پاٹن راجپوتانہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہیں۔ رسالہ "آفتاب" تقریباً دو سال سے آپ کی ادارت میں نہایت حسن و خوش اسلوبی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ آپ کے رشحۂ قلم سے کئی ناول یادگار ہیں۔ آپ کا کلام دورِ حاضر کی اردوئے معلےٰ کی مکمل تصویر ہے، محاورے کے ساتھ روزمرہ کی کھپت اس شستگی و برجستگی کے ساتھ کرتے کہ کلام میں ایک خاص قسم کی شیرینی اور طرفگی پیدا ہو جاتی ہے، آپ کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اپنے استاد مرزا داغ دہلوی کے بعد اردوئے معلےٰ کو فارسی کی تراکیب اور مغلق الفاظ سے کسی اور شاعر نے اس قدر پاک نہیں کیا تو شائد حقیقت کے خلاف نہ ہو گا۔ آپ کی پر گوئی کا یہ عالم ہے کہ تھوڑے سے وقت میں بڑی بڑی نظمیں کمال بے تکلفی کے ساتھ سر انجام کر سکتے ہیں! نثر نویسی میں بھی آپ پوری قدرت رکھتے ہیں اور ایک طرزِ خاص کے موجد ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

دھیانِ حقیقی سے طبیعت کو شرف ہے — جتنا کہیں اس کیف کو وہ حق بہ طرف ہے

چھینٹے نہ ہوں نیساں کے تو، بیکار صدف ہے — جوشش ہی کے دم سے لبِ ہر موج میں کف ہے

کوسوں بھی تو بہتا ہوا دھارا نہیں ملتا
چڑھ جائے یہ دریا تو کنارا نہیں ملتا

گوہر جو اُگلتا ہے، یہ شاعر کی ہے فطرت — ایسی نہیں ہوتی ہر اک انسان میں قدرت
خود وجد کو پیدا کرے، اتنی نہیں طاقت — خلاقِ جہاں کرتا ہے اس شے کو ودیعت

حصہ نہیں جس کا، اُسے دولت نہیں ملتی
نااہل کو مر کر بھی یہ نعمت نہیں ملتی

کچھ حرص و ہوا سے نہیں یہ رنگ چمکتا — جس پھول میں خوشبو نہ ہو، وہ کب ہے مہکتا!
بے موجِ ہوا بھی کوئی شعلہ ہے بھڑکتا؟ — دیکھا ہے کہیں طائرِ تصویر چہکتا!

یہ جوہر ذاتی ہے، زبانی نہیں ہوتا
کچھ نقل سے خلاقِ معانی نہیں ہوتا

غیروں کے خزانے سے جواہر بھی چرا لائے — اور خیر سے بے قاعدہ محفل میں سجائے
تن تن کے بڑے فخر سے اک اک کو دکھائے — پھر آپ کا کیا حق ہوا! وہ تو ہیں پرائے

یوں داد نہیں ملتی ہے امداد نہ کیجیے
للہ دماغ اڑتا ہے، فریاد نہ کیجیے

کیوں مضحکہ بنتے ہو؟ اٹھائے گا یہ غم کون — خاموش رہو، بزم میں کھاتا ہے بھرم کون
جس فن سے علاقہ نہیں، تم اسکے حَکَم کون؟ — اتنا بھی نہیں سوجھتا، تم کون ہو، ہم کون

ہم اس لیے حقدار ہیں، ہر طرح اثر کے
کاغذ پہ نہیں لفظ، یہ ٹکڑے ہیں جگر کے

سالِ نو

خدا کے فضل سے ہم سالِ نو کو دیکھتے ہیں
نئی روش، شہِ خاور کی ضو کو دیکھتے ہیں
ہماری عمر سے گو ایک سال ہیچ گیا
مگر زمانے کا یہ اک قدم ہے اور بڑھا
نظر پڑی جو نئے دن کی صبح آتے ہوئے
اُڑے پرند، درختوں سے چہچہاتے ہوئے
زمیں پہ پہلی کرن مہر کی جو ڈالی ہے
تو زر نگار، ہر اک پھول کی پیالی ہے
بچی کھچی ہوئی شبنم کی جو شراب ڈھلی
تو اس کی چسکی لگاتے ہی ہر کلی جھوم رہی
تغیرات ہیں، شام و پگاہ کی گردش
بدل رہی ہے سپید و سیاہ کی گردش
جہاں میں اب ہے نئے ہم جلیس کا دورہ
تمام ہو گیا اُنیس سو بیس کا دورہ

نالۂ یتیم

ایمان والو، چین سے بیٹھے ہوئے ہو اپنے گھر
ہے کیا ضرورت یہ تمہیں، لو دردمندوں کی خبر
تم پیٹ بھر کے کھاتے ہو، تم ٹھنڈا پانی پیتے ہو

ہم بھوک کے پیاسے پھر رہے ہیں، مارے مارے دربدر

پہنو لباسِ فاخرہ، اچھی سے اچھی ہے قبا

ہم کو بھی دیکھو تو ذرا۔ چیتھڑا نہیں ہے جسم پر

تم اونچے محلوں میں رہو، پھر روشنی بجلی کی ہو

ہم کو ہیں قبروں کے گڑھے، ہم سے تو اچھے جانور

وہ نرم بستر اور تم، یہ خاک پتھر اور ہم

انصاف کہتے ہیں اسے؟ کیوں جی؟ ملاؤ تو نظر!

اولاد والے تم بھی ہو رکھو کلیجے پر تو ہاتھ

ہم کس کے سینے سے لگیں؟ کس کو کہیں مادر پدر

بچے تمہارے خوش رہیں، کیا کیا وہ کرتے ہیں ضدیں

ہم جھڑکیاں کھاتے پھریں آخر یہ کیوں اس جرم پر؟

ہم بھی خدا کی جان ہیں، کچھ بھی سہی انسان ہیں

پھر صاحب ایمان ہیں، ایمان کی تو لو خبر

ہم واجب الامداد ہیں، حق ہے ہمارا بھی جناب

صورت سے کیا بیزار ہو، بھولے ہو کیا ام الکتاب

مذہب بدل لیں، کیا کریں؟ کچھ اور ہی کہلائیں ہم

تم تو نہیں سنتے خدا آخر کہاں مرجائیں ہم؟

ناٹک میں ناچیں؟ کیا کریں ہیجڑوں کی چیلیں بھریں؟

یا جھوٹے ٹکڑوں سے پلیں؟ بھوکے ہوں تو کیا کھائیں ہم؟

چوری کا لپکا ڈال لیں یا ڈاکے جا جا کر ڈالیں؟

عریاں ہیں تن کیونکر ڈھکیں؟ چادر کہاں سے لائیں ہم؟

فاقوں سے ہیں ہم نیم جاں، گن لو ہماری پسلیاں

محنت کے ہم قابل کہاں اٹھ اٹھ کے جب گر جائیں ہم

کہتے ہیں آسائش کیسے، ہم جیسے آئے ننھے چلے

پیدا ہوئے تو کس لئے، کس کام کو دکھ لائیں ہم

جب دل ہمارا ہل گیا، تو عرشِ اعظم ہل گیا

قدسی تڑپ جائیں ابھی، آنسو اگر بھر لائیں ہم

اللہ کے پیارے ہیں وہ، جو پیار کرتے ہیں ہمیں

تم سمجھے ہو جیسے آپ ہو، کس طرح سے سمجھائیں ہم

تم سایۂ دامن میں لو، تم ہاتھ تو سر پر رکھو

خوفِ خدا کچھ تو کرو، ایسا نہ ہو مٹ جائیں ہم

بہارِ ہندوستان

نیا سال تقدیر نے پھر دکھایا زمانے کا گلشن بہاروں پہ آیا

شگوفے کھلے، کونپلوں کو سجایا درختوں نے شاخوں کو دلہن بنایا

کھلے پھول، سبزے لہکنے لگے ہیں

گلستاں میں بلبل چہکنے لگے ہیں

چلو چل کے تربینی کا رنگ دیکھیں نظر کی کمندیں ہمالہ پہ پھینکیں
وہ جنگلی کی رُو ناما پٹی کی وہ سونیں وہ شاداب رمنے، وہ ہرتوں کی چوکیں

آہا عجب اُس کی قدرت عیاں ہے
بہشت بریں ہے کہ ہندوستاں ہے

کہیں مینہ برس کر وہ کھلنا آہاہا وہ ہر پھول پتی کا دُھلنا آہاہا
وہ قطروں کا کانٹوں میں ملنا آہاہا گل و سبزہ کا ملنا جلنا آہاہا

مبارک ہو اے ہند، تجھ کو فضائیں
یہ سبزہ، یہ گل اور یہ اُودی گھٹائیں

سروں پر وہ نیلاہٹیں آسماں کی دھنک ترچھی ترچھی وہ بانکی کماں کی
اچانک جھلک مہر شعلہ فشاں کی کہوں کیا! کہ قدرت نہیں ہے بیاں کی

نظر باز ہی کوئی پہچانتا ہے
کہ جو دیکھتا ہے وہی جانتا ہے

یہ سب کچھ مناسب، مگر اے مری ماں مجھے دل سے بھاتا نہیں کوئی ساماں
تری مدح حاضر ہے گو میرا ایماں میں سو بار ہندوستاں تجھ پر قرباں

مگر کیا کروں دل میں سوزِ نہاں ہے
جو سچی خوشی ہے وہ پیارے کہاں ہے

ہے دوران خوں مجھ کو شعلے کی تیزی ہوا معتدل تیز ہے اک چھری سی
یہ فصلِ بہاری، خزاں پوری پوری یہ بارانِ رحمت گھٹائیں ہیں غم کی

تری آبیاری سے لب تشنہ ہوں میں
ستم دیدۂ زخم صد دشنہ ہوں میں

نہ پاسِ حمیت، نہ ہے پاسِ غیرت — تجھے غیر سے لطف، اپنوں سے نفرت
تو اوروں کا محتاج، اوروں سے بیعت — خدا ہی سنبھالے گا اب تیری حالت

بہت فقر و فاقہ میں اپنی کٹی ہے
شریفوں کے بیٹوں پہ پٹی بندھی ہے

بھروسہ نہیں اپنے اوپر تجھے جو — یہی تو قیامت ہے، اب تجھ سے کیا ہو
تری مفلسی ہاں، نہ جائے گی یوں تو — سمجھتا ہے شل اپنے ہی بازوؤں کو

بھلا حال کیا اس کا ہندوستاں ہو
جو اپنے لیے آپ بارِ گراں ہو

ذریعے جو قدرت نے ہیں تجھ کو بخشے — انہیں پر بھروسہ کرے، کر کے دیکھے
خدا چاہے بس پھر تو ہیں پار بیڑے — یہ تفکر ہزاروں ہوں تیری بلا سے

خبردار، یہ فکر بے جا نہ کرنا
فلک کی دو رنگی کی پروا نہ کرنا

چٹانوں کو دیکھا ہے میں نے یہ اکثر — تھپیڑے سمندر کے کھاتی ہیں جم کر
پڑے غار ہر غار جسموں کے اوپر — مگر توبہ توبہ، سر کتنا ہے لنگر؟

وہ جس طرح قدموں کو گاڑے کھڑی ہیں
اسی طرح پانی کو پھاڑے کھڑی ہیں

مرقعِ نشاط

گلزارِ جہاں، رحمتِ باری سے بھرا ہے — قدرت کے قلمکار کا ہر نقش کھرا ہے
جو برگ ہے، عکسِ خطِ جوہر سے بھرا ہے — آئینہ ہے، تصویر کے آگے جو دھرا ہے

اب دید کی طاقت نہیں، تھکنے لگیں آنکھیں
خیرہ ہوئی جاتی ہیں، جھپکنے لگیں آنکھیں

وہ صبح، دمِ صبح کی وہ نور فشانی — شاداب، چمن زار میں ستھرا ہوا پانی
سوئے ہوئے سبزے میں، دبے پاؤں روانی — دیکھا نہیں، یوں پر جیب الماس کو دہانی
عکسِ گلِ خورشید اتر لے لگے دیکھو
تو رنگ سے مضمون سنورنے لگے دیکھو

وہ دستِ سبک موج کا تھم تھم کے لگانا — پھیلے ہوئے دامن کا سمٹتے ہوئے آنا
پھولوں کا ابھرنا، کبھی غنچوں کا بجانا — لالے نے دبایا ہے ترم آب خزانا
اب ان کے کرشموں پہ نظر غیر کریں گے
منہ دھو کے حسینانِ چمن سیر کریں گے

راحت کے کہاں تک شجر سبز مزے ہیں — جنبش میں ہیں شاخیں کہ وہ بیدار ہو کھیلیں
شبنم بھی تو موجود ہے، چھینٹیں ذرا دے لیں — انگڑائی وہ لی، کروٹیں لینے لگیں بیلیں
کیا ناگنیں ہیں، شوخیِ رفتار کے اوپر
بل کھا کے چڑھی جاتی ہیں دیوار کے اوپر

ہیں سرخ کہیں زرد، کہیں پھول ہیں آبی — تصویر سے تصویر نکلتی ہے جوابی
ڈھلتی ہے سرِ بزم گلابی پہ گلابی — ہیں ڈالیاں لغزش میں کہ بدمست شرابی
دلشاد ہیں سب گود میں غنچے ہیں پری کے
گلبازیاں ہوتی ہیں نسیمِ سحری سے

شورش میں ہیں طائر، ورقِ گل کی چمک سے — بکسی ہوئی کلیاں بھی تو اڑتی ہیں جھجک سے

چنگاریاں گرتی ہیں جو غنچوں کی چٹک سے — بلبل نے لگا دی ہے نئی آگ چہک سے

نغمے کی صدا جب کوئی منقار سے نکلی
شعلے کی لپک، آتشِ گلزار سے نکلی

مرغانِ چمن کے لئے بلبل کا اشارا — بارود میں گویا کہ پڑا اڑ کے شرارا
یا تیر تھا، جو نعرۂ مستانہ نے مارا — بھر گیا تھا، وہ چہکے کہ چمن اڑ گیا سارا

رہ رہ کے ترنم کی صدا گونج رہی ہے
سن ہیں در و دیوار، ہوا گونج رہی ہے

طرزِ قدیم

جب مرے ہونٹوں سے لعلِ شکریں چھوٹے ہوئے
لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے

بزمِ دشمن سے اب آئے ہو، مزے لوٹے ہوئے؟
ہوش میں آؤ - کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے؟

تم یہاں دیکھو تو آکر، ہجر میں کیا حال ہے؟
دل کے ہاتھوں آج سنو تو حشر ہیں لوٹے ہوئے

وائے ناکامی، کہ گلشن میں بہار آنے لگی
دو ہی دن گذرے تھے ہم کو: قید سے چھوٹے ہوئے

چاہنے والے، تری فرقت میں جی سکتے نہیں
زندگی سے ہیں وفاداروں کے جی چھوٹے ہوئے

سچ یہ ہے، گرنا پرائی آگ میں اچھا نہیں
دل کو روتے ہیں، جگر کے آبلے پھوٹے ہوئے

شمع کا آنسو نہیں تھمتا ہے ان کی یاد میں
اڑتے پھرتے ہیں جو پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے

اپنی سوزش کا کیا ہے شمع نے اچھا علاج
رکھ لیے ہیں دل میں پروانوں کے پر لٹتے ہوئے

دلفریبی لالہ رو یوں کی نہیں مٹتی کبھی
یہ ستمگر، خاک ہو کر بھی تو گل بوٹے ہوئے

سونگھ لے شاعر، اگر ہے کچھ دماغ بوئے گل
یہ مرے گلشن کے تازے پھول ہیں کچھ ٹوٹے ہوئے

(از گلدستہ سخن)

مطبوعہ ۱۹۲۲ء لاہور

جادو طراز

لالہ سری رام دہلوی

سخنورِ شیوا بیان، سحر زبان شاعرِ جادو طراز آغا ظفر علی قزلباش دہلوی - قدرت کا منشا تھا کہ شاعری کی دنیا میں ناموری ہوں، شہرت پائیں، دلّی کے فصیح محاورات، ٹکسالی زبان کو برتیں، طبیعت لڑکپن ہی سے چلبلی اور شوخ تھی - نواب احمد سعید خاں طالبؔ کے فیضِ خدمت اور نواب شجاع الدین تاباںؔ کی حوصلہ افزائی نے اُس میں اور بھی چار چاند لگا دیئے، آپ دہلی کے مشاعروں میں اپنی خوش گوئی کی داد لینے کے بعد حضرت داغؔ کے تلامذہ میں داخل ہوگئے، اور خط و کتابت کے ذریعہ سے ان کو اپنا کلام دکھانے لگے، ابتدا میں طبیعت کی تیزی، روانی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک دن میں چار سو پانچ سو اشعار کہہ لیتے، اور وہ مشاعروں میں اپنے شاگردوں کو تقسیم کر دیتے شعر گوئی کے آغاز ہی سے اُنھوں نے دہلی میں اپنا علمِ اُستادی بلند کیا تھا۔ اور اُن کے ماننے والوں کی تعداد کافی تھی - رفتہ رفتہ بعض غزلیات اربابِ نشاط کے کوٹھوں اور گلی کوچوں میں گائی جانے لگیں، اس وقت کے اساتذہ مثلاً مولانا حالیؔ، ظہیرؔ، مجروحؔ، طالبؔ، ثاقبؔ، راسخؔ، برترؔ وغیرہ انکی ذہانت طباعی، سلاست بیانی کے معترف تھے، بندش کی خوش اسلوبی، اور اندازِ بیان کی ندرت، مضمون کی شوخی سے مل کر مزا دو بالا کر دیتی ہے، اور مشاعرے

میں آپ کی غزل خوانی قابلِ شُنید ہوتی ہے۔ اسی عرصے میں اخبار وکیل سے ان کا تعلق ہوگیا، اور اس میں ایک افسانہ شائع ہونے سے ان کی ادبی حلقوں میں شہرت ہونے لگی۔ مگر اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا سلسلہ تھوڑے ہی روز میں جاتا رہا۔ دہلی سے بہ تلاش معاش حیدر آباد تشریف لے گئے۔ اُس زمانے میں فصیح الملک مرزا داغ کی شاعری کا آفتاب سپہرِ نظم پر تاباں تھا۔ دکن کے مشاعروں میں ان کی شاعری کا طوطی بولنے لگا۔ بعض حساد اور تنگ نظر شعرا نے انہیں اپنے علم و فضل کے اثر سے دبانا چاہا لیکن ذہن کی خوبی اور طبیعت کی خوش اسلوبی خصوصاً زبان کی روانی سے ان پر کوئی غالب نہ آسکا۔ اور ہمیشہ بزمِ سخن میں ان کا وقار قائم رہا۔ اسی عرصے میں یہ مہاراجہ کشن پرشاد و راجہ امانت دنت کے ہاں بزمرۂ شعرا ملازم ہوگئے مگر قسمت نے وہاں بھی نہ رہنے دیا، جوانی کا زمانہ، شباب کے دن، سِن۔ طبیعت عشق آشنا، خیالات شورش پسند، آخر کار تا تک کمپنیوں تک پہونچے۔ اور ڈراما نگاری کے ذریعہ کلکتے میں بسر اوقات کرتے رہے، دو تین سال تک بیگم صاحبہ مرشد آباد کے داماد نواب نصیر الممالک سفیر ایران کی مصاحبت میں رہے۔ وہیں سے "افسر الشعرا" کا خطاب پایا۔ ہم اس موقع پر نہ حضرت داغ کی جانشینی کا مسئلہ چھیڑنا چاہتے ہیں، اور نہ دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ آغا شاعر کو اُستاد مان لے۔ لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ طبع رواں کے جوہر، تغزل کی اصلی شان، عاشق و معشوق کی گفتگو، اور روزمرہ کے دلفریب اسلوب اور بے تکلفانہ محاورات جو داغ کی شاعری کا زبردست

عنصر ہیں، آغا شاعر کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

گو جذباتِ فطرت اور تخیّل کی بلندی نے داؔغ کی شاعری کا زمانہ ختم کر دیا ہے لیکن جبتک دُنیا میں اُردو زبان کا وجود رہے گا، محاوراتِ داؔغ زندہ رہیں گے۔ اس وقت ان کی عمر چون پچپن برس کی ہوگی۔ جو شوخی اور بانکپن ان کے کلام میں ہے، اُس کی نظیر موجودہ شعرا کے ہاں کم ملتی ہے۔

آغا صاحب کئی کتابوں کے مصنّف ہیں جن میں "قتلِ نظیر" نے بہت شہرت پائی۔ فسانہ نگاری میں یگانہ، اور ڈراما نویسی میں فخرِ زمانہ ہیں، علم مجلسی اور اخلاق میں فرد، آزادیٔ ہند کے حامی، اور قلم کے مرد ہیں، آپ نے ریاست جھالاواڑ سے ایک رسالہ "آفتاب" کے نام سے نکالا تھا، آپ مہاراجہ صاحب جھالاواڑ کے درباری شعرا میں دس برس سے منسلک ہیں۔ آپ نے فصیح اُردو میں کلام مجید کا ترجمہ نظم کیا ہے، مزے دار شعر کہتے ہیں، ان کا یہ شعر

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سُنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا

حوادثِ زمانہ سے چوٹ کھائے ہوئے دل کا مرقع کس قدر دلفریب ہے۔

دیوانِ اول۔ تیر و نشتر کے نام سے مخزن پریس میں شائع ہو چکا ہے دُوسرا دیوان بھی تیار ہے۔

بہ تحریک اپنے محسن مہاراجہ سر بھوانی سنگھ والیٔ جھالاواڑ جنہیں علم و دانش کا پتلا کہنا زیبا ہے، رباعیات عمر خیام کا فصیح ٹکسالی اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے، اور اب اُسے چھپوانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

راقم تذکرہ سے عرصہ تیس سال سے ان کے نہایت خوشگوار مراسم ہیں۔ کئی مرتبہ میرے مکان پر مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں، اور مشاہیر عصر مثل راجہ محمود آباد، نواب مدارالمہام سر علی امام کو کلام سنایا اور اُن سے داد لی ہے۔ مذہباً شیعہ ہیں، مرثیہ کہتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی۔ دو تین مرتبہ ریاست خیرپور سندھ ایامِ عشرہ میں بلائے گئے ہیں۔ اور رئیسِ وقت کی طرف سے آپ کی قدردانی بھی کی گئی، شاگردوں کی تعداد دو تین سو سے کم نہیں، جس میں برق دہلوی، مائل دہلوی، ہاشم، نسیم، شوق وغیرہ اچھا کہنے والوں میں سے ہیں۔ عرصے سے آپ اپنا تازہ کلام راقم تذکرہ کو بھیجتے رہتے ہیں۔ اس لئے کلام کا بہترین حصہ شائقین اور قدر دانِ سخن کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ پڑھیے اور مزے لیں۔

مری آنکھیں ہیں یہ موجود، انہیں فرش کریں
مرے پہلو میں رہیں آپ، مرا دل ہو کر
دن جوانی کے جو آئے انہیں پردہ سوجھا
کھنچ گئے آہ، وہ تصویر کے قابل ہو کر
خون ہو ہو کے بہے لختِ جگر آنکھوں سے
دو گھڑی بھی نہ بنی درد کے شامل ہو کر

کعبہ سے دیر، دیر سے کعبہ
مار ڈالے گی راہ کی گردش

ٹھیس لگتے ہی ٹوٹ جائے گا
شیشۂ دل حباب ہے بالکل

تم تک آ بھی نہ سکوں، تم کو بلا بھی نہ سکوں
یہ تو کچھ ایسی دھری ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
میٹھی میٹھی وہ خلش دی ہے ترے تیروں نے
دل میں رکھ بھی نہ سکوں جان سے جا بھی نہ سکوں
صفحۂ دہر سے کس طرح مٹے گریۂ خوں
حرفِ تم ہے کہ جو کاغذ سے اٹھا بھی نہ سکوں

روز فرماتے ہیں، ہم چاہیں تو مٹ جاؤ ابھی
دیکھنا کیا مری تقدیر بنے بیٹھے ہیں

بس چلو ہو چکا، اتنا نہیں بنتے توبہ   دیکھنا رات گزر جائے نہ ساماں میں

ہم تمھیں یاد بھی آئیں، تو کبھی بھولے سے
تم ہمیں بھول بھی جاؤ تو، بہت یاد کریں
آدمی آدمی سے ملتا ہے   بات کرنی تو کچھ گناہ نہیں
وہی خاک میں مل گئے سب سے پہلے
جنھیں حسن و خوبی کے دعوے رہے ہیں
نام کو بھی کبھی، تسکین دلِ مضطر میں نہیں
موت ہی آئے، جو تم، میرے مقدر میں نہیں

تم نہ سمجھے تھے کہ مایوسیاں کیا کرتی ہیں ؟
ہم نہ کہتے تھے کہ بیمار، گھڑی بھر میں نہیں
آپ چاہیں تو ابھی دن مرے پھر جاتے ہیں
کون سی بات ہے جو آپ کے امکاں میں نہیں؟
رُوح کو تن سے نکلتے ہوئے موت آتی ہے
یہ وہ قیدی ہے، اذیّت جسے زنداں میں نہیں
ابھی دو دن ہوئے شاعر کہ بھلا چنگا تھا
سانس کا کھیل ہے بس، کچھ بھی تو انساں میں نہیں

کبھی آنکھوں میں رہتے ہیں کبھی وہ دل میں رہتے ہیں
بڑے بے چین ہیں، ہم تو بڑی مشکل میں رہتے ہیں
کبھی ان آنکھوں سے مُردے جلائے جاتے تھے
انہیں میں آج مروّت نہیں ہے، پیار نہیں
ملنا نہ ملنا یہ تو مقدّر کی بات ہے
تم خوش رہو، رہو مرے پیارے جہاں کہیں
جاؤ سدھارو، تم سے بنی ہے نہ بن سکے
لیتے ہیں دل میں بیٹھ کے یوں چٹکیاں کہیں
پہرا بٹھا دیا ہے، یہ قیدِ حیات نے
سایہ بھی ساتھ ساتھ ہے جاؤں جہاں کہیں

پی بھی تو شاعر سمجھ رکھی ہے تو یہ آپ کی
چھوڑ سکتا ہے کوئی مردِ خدا برسات میں؟

ناصح کسی کی آنکھ جو کہہ جائے بزم میں
تیرے فرشتے خاں کو بھی اُس کی خبر نہ ہو

جھلکی دکھائی، سامنے آئے چلے گئے
یاد شش بخیر، تم بھی عجب پردہ دار ہو

ہم سے نہ ملئے، آپ نے تو کہہ دیا، مگر
وہ کیا کرے غریب، جو بے اختیار ہو؟

بڑے مجبور ہیں، کس طرح چھوڑیں اپنی عادت کو
بتوں پر ٹوٹ کر آنا سکھایا ہے طبیعت کو

جہاں تم مُسکرائے دوڑ کر ہم پیار کر لیں گے
لگانا ہاتھ پیچھے، پہلے سُن لو، دل کی قیمت کو

اک دن برس پڑو گے، ہمیں پر یہ کھُل گیا
کب تک پھرو گے، روز، مری جاں بھرے ہوئے

قدم کو پھونک کر رکھے کوئی کیسا ہی دُنیا میں
نہیں رُکتی کسی سے ہونے والی ہو ہی جاتی ہے

ابرو ہیں دونوں، دل کے خریدار دیکھئے
آپس میں چلنے والی ہے تلوار دیکھئے

ٹپکتا ہے، برستا ہے، یہی اندازِ قاتل سے
رنگیلا، آج ہولی کھیلنے نکلا ہے بسمل سے

جُدا ہونا تھا ہو نکلے، خفا ہونا تھا ہو نکلے
سبھی کچھ ہو چکا اب کیا مری تقدیر ہو جانے؟

قیامت بن کے ہر شوخی تری رفتار سے نکلی
جہاں سایہ پڑا گویا پری دیوار سے نکلی

حُسنِ رفتہ کا اب ملال ہی کیا   عارضی چیز تھی، رہی نہ رہی

صیاد نے چمن کی ہوا تک نہ دی ہمیں
آئے بھی، اور چلے بھی گئے، دن بہار کے

بڑے چین سے قبر میں سو رہا ہوں
نیا آسماں ہے نرالی زمیں ہے

مٹتے مٹتے بھی محبت کا نشاں رہتا ہے
بجھتے بجھتے بھی سرِ شمع دُھواں رہتا ہے

قیامت بھی کچھ سوچ کر بچ گئی   وہ محشر میں آئے ہنسی بچ گئی

یہ سچ کہا ہے کسی نے ضرور ہوتا ہے
نظر سے دُور جو ہو دل سے دُور ہوتا ہے

ہمیں تو ایسی کچھ عادت نہیں ہے بادہ نوشی کی
بہار آئی ہے زاہد اس لئے تھوڑی سی پی لی ہے

آدمیت نے ہمیں کیا کیا دیا
حق شناسی، انکساری، عقل و علم

آپ بھی تو منہ سے پھوٹیں کیا دیا
دل دیا ہم نے، جگر اپنا دیا

دُنیا میں کوئی دوست کسی کا نہیں ہوتا
اپنا بھی بُرے وقت میں اپنا نہیں ہوتا

کس طرح جوانی میں چلوں راہ پہ ناصح
یہ عمر ہی ایسی ہے، سُجھائی نہیں دیتا

خدا کے لئے، ہاں، نہیں، کچھ تو کہدو
کہ مُنہ تک رہی ہے، تمنّا، تمھارا

بجلی کی طرح آئے، ہَوا کی طرح چلے
کیا تم بھی کوئی دل ہو کسی بیقرار کا؟

شیخ کو جو پارسا کہتا ہے، اُس کو کیا کہوں
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ میخانے میں تھا

شاعرِ نازک طبیعت ہوں، مرا دل کٹ گیا
ساقیا، لینا، کہ شاید بال پیمانے میں تھا

مُسافرانِ عدم، کس زمیں پہ جاتے ہیں
کسی کا گور سے آگے پتا نہیں ملتا

یہ دل سی چیز لے کر تم ہمیں واپس بھی کردو گے؟
نظر پہچانتے ہیں، ہم تمہارا دل سمجھتے ہیں

چار دن کے بعد غنچہ، پھول کے ہم شکل تھا
رنگ دیتے ہیں یونہی تصویر سے تصویر کو

بدل دی انقلابِ دہر نے تاثیرِ میخانہ
یہ آنکھیں رہ گئیں، اتری ہوئی تصویرِ میخانہ
اثر اتنا تو ہو، آنے لگے بوُئے شراب اُس سے
کہ جس کاغذ پہ کوئی کھینچ دے تصویرِ میخانہ

نہ نکلا مُنہ سے کچھ، نکلی نہ کچھ بھی قلبِ مضطر کی
کسی کے سامنے میں بن گیا تصویر پتھّر کی
لحد میں اُن کے جسمِ نازنیں پر کیا گزرتی ہے
سحر تک، جن کو بے چینی رہی ہو، چینِ بستر کی
سنبھل کر دیکھنا آرائشوں کے بعد آئینہ
یہ آئینہ نہیں ہے، اب یہ ٹکڑے ہے برابر کی؟

بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے
ہوش میں آؤ، کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے
چاہنے والے، تری فرقت میں جی سکتے نہیں
زندگی سے ہیں وفاداروں کے جی چھوٹے ہوئے
دلفریبی لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی
یہ ستمگر، خاک ہو کر بھی تو گل بوٹے ہوئے

اپنی سوزش کا کیا ہے شمع نے اچھا علاج
دکھ لیے ہیں دل میں پروانوں کے پَر ٹوٹے ہوئے

وہ صاف دل ہوں، کوئی بات پیچدار نہیں
اس آئینے میں کہیں نام کو غُبار نہیں

میں کہتا ہوں مجھ میں تو نہیں کوئی ہنر بھی
دل کہتا ہے خاموش کسی کو ہو نظر بھی
اب بھی جو گزر جاتی ہے چلتی ہوئی مُورت
دل کھنچتا ہے، دم کھنچتا ہے، کھنچتی ہے نظر بھی

گری، گر کر اُٹھی، پلٹی تو جو کچھ تھا اُٹھا لائی
نظر کیا کیمیا تھی، رنگ چہروں سے اُڑا لائی
خدا کے واسطے، سفّاکیاں یہ کس سے سیکھی ہیں
نظر سے پیار مانگا تھا، وہ اک خنجر اُٹھا لائی

فرشِ زمیں سے اوج ہوا پر بلند ہے
اب آدمی بھی ایک طرح کا پرند ہے
بلبل کو ایک مشتِ پرِ استخواں سمجھ
گُل کیا ہے دستۂ ورقِ چند چند ہے
لو آؤ میں بتاؤں طلسمِ جہاں کا راز
جو کچھ ہے سب خیال کی مٹھی میں بند ہے
قائل ہوں، منافق کی سیاست نظری کا
کیا حرف مشدّد ہے اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

(منقول از خمخانۂ جاوید۔ جلد چہارم)

مُحبِّ وطن

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

خدا انہیں جنت نصیب کرے، حضرت آغا شاعر دہلوی سے اب سے ٹھیک چالیس برس پہلے ملاقات ہوئی تھی۔

سُرخ و سفید نوجوان، بھرا ہوا بدن، چوڑا سینہ، بڑی بڑی خوبصورت رسیلی آنکھیں، چہرے پر ایک خاص قسم کا رعب و جلال۔ البیلی وضع۔ سر پہ مشہدی لنگی۔ بدن پر خوب چُست۔ حیدر آبادی شیروانی۔ غرضکہ بہ ہیئت مجموعی ایک ایسی ہستی تھے کہ مشاعرے میں ہر شخص کی نگاہ انہی پر پڑتی تھی۔

آگرے میں اُس وقت شاہ دلگیر کی اُٹھتی جوانی تھی، اور طبیعت میں شعر و سخن کا ذوق، میوہ کٹرے میں رہتے تھے، مہینے کے مہینے کچھ مقامی اور کچھ پردیسی شعرا کو کھینچ بلاتے تھے۔ حق یہ ہے کہ مہمان داری اور تواضع کا حق ادا کر دیا کرتے تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

میں اس زمانے میں آگرے میں پڑھتا تھا۔ شعر و سخن سے مجھے بھی تھوڑی سی دلچسپی تھی۔ اس لئے کوئی بلائے یا نہ بلائے، قریب قریب ہر مشاعرے میں جا بیٹھتا تھا۔ شاہ دلگیر کے ہاں مشاعرہ تھا۔ بجلی تو اُن دنوں کہاں تھی۔ لیکن لمپوں اور شمعوں کی روشنی سے کمرہ جگمگا رہا تھا۔ آگرہ کے رئیس الشعرا میر خادم حسین رئیسؔ اپنے شاگردوں کی ایک پوری پلٹن لئے

مشاعرے کے وقتِ مقررہ سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد بڑے کروفر سے تشریف لائے۔ اور چونکہ مانے ہوئے استاد تھے۔ اس لیے حاضرین نے سروقد ہوکر تعظیم دی اور وہ صدر میں جو مسند بچھی ہوئی تھی اُس پر جا بیٹھے۔ شیخ بزرگ علی عالی اور ماسٹر تصدق حسین صاحب واصف سے اکثر رئیس صاحب کی چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ کیونکہ یہ دونوں بزرگ بھی بہت اچھا کہنے والوں میں سے تھے، اس لئے میر صاحب نے ان دونوں کی طرف دیکھا، مسکرائے اور بڑے تپاک سے سلام کیا۔ طوطوں کا جھلڑ جس طرح آم کے پیڑ پر گرتا ہے، بالکل اسی طرح میر صاحب کے شاگردوں کا لشکر کمرے کے فرش پر گرا اور جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔

حضرت آغا شاعر، شاہ دلگیر صاحب اور میں ایک طرف کو کونے میں بیٹھے تھے۔ میر صاحب نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ تو حضرتِ شاعر پر ضرور ڈالی، لیکن کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن شاعر کی انوکھی شان، نرالی ادا، اور ظاہری آن بان ایسی چیزیں نہ تھیں کہ جو میر صاحب کی بے توجہی کو قائم رہنے دیتیں، آغا کی طرف پھر دیکھا اور پھر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہے۔ صبر نہ ہوا تو دلگیر سے پوچھا آپ کی تعریف؟ دلگیر بڑے دل لگی باز آدمی تھے۔ یوں ہی کچھ فرضی نام بتا دیا۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ آغا کی وجاہت غمازی کر رہی تھی، میر صاحب کو دلگیر کے کہنے کا یقین نہ آیا، اپنی جگہ سے اٹھ کر آئے۔ اور بہت اصرار کرکے اپنی مسند پر لے گئے اور اپنے برابر بٹھا لیا۔

مشاعرہ شروع ہوا میرِ مشاعرہ یعنی دلگیر صاحب نے اپنی غزل سے

ابتدا کی۔ اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے رئیسؔ، عالیؔ اور واصفؔ کے شاگردوں نے آنا غزل پڑھنا، اور واپس اپنی جگہ پر جانا شروع کر دیا۔ تانتا بندھ گیا۔ مجھے وہ کہانی یاد آگئی جو انگریزی کی کسی ریڈر میں پڑھی تھی کہ ایک ٹڈی آئی اور ایک دانہ لے گئی۔ پھر ایک ٹڈی آئی اور دانہ لے گئی۔

بالکل یہی حال مشاعرے میں رونما تھا کہ پھر ایک شاگرد آیا۔ اپنی غزل پڑھی اور واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں نے یہ کہانی آغا صاحب کو سنائی تو بہت محظوظ ہوئے۔ خدا خدا کرکے کہیں دو بجے ان شاگردوں کا غیر متناہی سلسلہ انتہا کو پہنچا، اور اب آغا صاحب نے یہ دیکھ کر کہ صرف اساتذہ ہی باقی رہ گئے ہیں، بہت اصرار کیا کہ ان سب سے پہلے انہیں پڑھ لینے دیا جائے لیکن اساتذہ نے خاطرِ مہمانِ عزیز کے مصداق، آغا صاحب کو اجازت نہ دی، شیخ بزرگ علی صاحب عالیؔ نے جیب میں سے غزل نکالنے میں قصداً ذرا دیر لگائی، تاکہ واصفؔ صاحب پہلے پڑھ لیں۔ لیکن زبان سے یہی کہتے رہے کہ:۔
"جناب ماسٹر صاحب، قسم خدا کی آپ کیا غضب کر رہے ہیں، کمبخت اچکن کی جیب خدا جانے کدھر چلی گئی۔ ماسٹر صاحب یہ ہرگز نہ ہوگا پہلے میں...... نفرہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ حضرت واصفؔ نے اپنی غزل شروع کر دی، اور اس کے بعد عالیؔ صاحب کو جیب بھی مل گئی اور جیب کی غزل بھی۔

واصفؔ صاحب بہت ہی خوشگو شاعر تھے۔ اور جہاں تک فنِ شعر کا تعلق ہے، اُن کی شاعری حضرت عالیؔ سے بہت بلند تھی۔ جیسے ہی اُنہوں نے یہ غیر طرحی مطلع پڑھا۔

اک سیم تن کا وصل کی شب یوں کلام ہے
اس گھر میں آ کے اب مجھے سونا حرام ہے

تو ہر طرف سے واہ واہ کا شور برپا ہو گیا، شیخ عالی صاحب جھومنے لگے۔ حضرت رئیس نے بھی بہت ہی مربیانہ انداز میں فرمایا کہ "بھئی ماسٹر صاحب خوب کہا ہے" لیکن ہمارے آغا صاحب نہ وجد میں آئے اور نہ چلائے، آہستہ سے مسکرا کر اور سبحان اللہ کہہ کر رہ گئے، کسی قدر رعب تو آغا صاحب کا پہلے ہی سے طاری تھا۔ اس واقعہ نے اور بھی کان کھڑے کر دیئے۔

واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور میں واصف صاحب کی طرحی اور غیر طرحی دونوں ختم ہوئیں، اور جب آغا شاعر نے پہلو بدلا،

"پہلے میں پڑھ لوں، اجی حضرت ذرا توقف تو فرمایئے" کی صدائیں بلند ہوئیں، لیکن آغا صاحب ایک عزم صمیم کے ساتھ سیدھے ہو بیٹھے۔ اور فرمایا کہ "اجازت ہو تو اُستاد مدظلہٗ کے دو شعر تبرک کے طور پر پڑھ دوں"

"فرمایئے، فرمایئے" کا شور جب بند ہوا تو آغا صاحب نے حضرت داغؔ کا یہ مشہور مطلع پڑھا،

کعبے کی ہے ہوس، کبھی کوئے بتاں کی ہے
مجھ کو خبر نہیں، مری مٹی کہاں کی ہے؟

حضرت آغا شاعر کی آواز اتنی بلند تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کمرے کی چھت پھٹ جائے گی، میں نے اتنے اچھے طریقے پر اور اس قدر زوردار آواز میں کبھی کسی کو پڑھتے نہیں سُنا۔ انھوں نے صرف اپنی آواز ہی سُنا کر مشاعرہ جیت لیا تھا'

اسی غزل کا ایک شعر اور سنا کر انھوں نے اپنی غزل شروع کی،

کوئی اتنا نہیں لیجائے میرے سوگواروں میں
کہ اب تک حسرتیں ٹکراتی پھرتی ہیں مزاروں میں

جس دل کش انداز میں یہ مطلع سنایا گیا تھا۔ وہ آجتک میری نگاہوں کے سامنے ہے، اور جس پاٹ دار آواز میں وہ سنایا گیا تھا وہ آجتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آغا کا ایک ایک شعر، دو، دو اور تین، تین مرتبہ پڑھوایا گیا۔ اندان کے بعد عالی اور رئیس نے اپنی اپنی غزلیں پڑھیں، تو ضرور لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ بڑی کوشش کے ساتھ حلق میں سے آواز نکال رہے ہیں۔ عالی صاحب نے تو بلا مبالغہ اس طرح غزل سنائی کہ گویا رو رہے ہیں، البتہ جناب رئیس کی غزل بھی اچھی تھی۔ اور وہ اچھی خاصی طرح اس کو سنا بھی گئے،

وہ پہلا دن تھا، جب جنابِ آغا شاعر کی شخصیت، اور اُن کی شاعری سے میں دونوں ہی چیزوں کا تہِ دل سے معترف ہوا تھا۔ اُن کا کلام اگرچہ مختلف رسالوں میں نظر سے گذرتا رہا، اور ان کے بلند پایہ مضامین گاہے گاہے پڑھنے کا اتفاق بھی لیکن میرے دلی آنے سے پیشتر ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ ان کی ملاقات سے شرف اندوز ہوتا، میں ابھی ملازمت کے سلسلے میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اور اُنھیں بھی ان کے کلام کے قدردان کبھی چھالا وار لے گئے اور کبھی خیر لوہ،

ایک مدّت دراز کے بعد، یوں کہنا چاہیے کہ تیس سال کا طویل زمانہ

گذارنے کے بعد دہلی میں دوبارہ نیاز حاصل ہوا، مجھ میں خصوصیت ہی کیا تھی جو وہ اتنی مدت تک یاد رکھتے، لیکن جب میں نے آگرے کے مشاعرے کا ذکر کیا تو انھیں یاد آیا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اُدھر جب تک زندہ رہے، میرے حال پر شفقت ہی فرماتے رہے۔

اپنی شاعری کے آخری دور میں آغا صاحب نے سیاسی نظمیں بھی لکھی ہیں، اور چونکہ دل میں قوم اور وطن کا سچا درد موجود تھا۔ اس لئے اُن کی اس قسم کی نظمیں بہت ہی موثر ہوتی تھیں، حضرت آغا شاعرؔ ایک مخلص، وطن دوست، اور سچے قوم پرور تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ہمیشہ دل سے کوشاں رہتے تھے،

نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کی وفات پر اِن کے شاگردوں میں اُن کی جانشینی کے متعلق بہت دنوں تک جھگڑا رہا، حضرت بیخودؔ اور نواب سائلؔ دونوں مسند نشینی کے مدعی تھے۔ لیکن میں نے اکثر اہل الرائے کو کہتے سُنا کہ داغؔ کی جانشینی کا دعویٰ صرف آغا شاعرؔ کو زیب دے سکتا ہے، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ خود آغا شاعرؔ نے کبھی اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا، شاید حق وہی ہوتا ہے کہ جو حق دار کی زبان سے نہیں بلکہ دوسروں کی زبان سے سُننے میں آئے،

حقیقت یہ ہے کہ آغا شاعرؔ مرحوم کی وفات نے اردو زبان کے شعر و ادب کو ایک ایسا نقصان پہونچایا کہ جو آسانی سے پورا نہیں ہو سکتا، اور ہمارے موجودہ رجحانات اور

دورِ حاضر کی بد ذوقی سے، امید نہیں پڑتی کہ جو جگہ آغا مرحوم نے خالی کی ہے وہ پُر ہو جائے۔

وہ صدا جوان کانوں نے آگرہ میں ۱۹۰۱ء میں سُنی تھی، بدستور ان کانوں میں اس وقت تک گونجتی رہیگی کہ جب تک وہ ہمیشہ کے لئے سُننے سے محروم نہ ہو جائیں۔

سدا رہے نام اللہ کا۔

(ریختستان دلّی سے)

آغا شاعر کی ناول نگاری

ڈاکٹر سہیل بخاری

آغا شاعر دہلوی فنِ شعر گوئی میں داغ دہلوی کے شاگرد اور بہت اچھے جدت پسند شاعر تھے، شعر کہنے کے علاوہ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے اور ناول بھی — ان میں طلسمی بدلہ" تو ترجمہ ہے البتہ "ہیرے کی کنی" "ناہید" "ارمان" اور "نقلی تاجدار" ان کے طبع زاد ناول ہیں۔ ان میں "نقلی تاجدار" ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا۔ "ہیرے کی کنی" ایک رومانی ناول ہے، جس میں طبقۂ اعلےٰ کا معاشقہ بیان کیا گیا ہے، نواب جہانگیر احمد خاں پربھومالی کی بیٹی کیسری پر عاشق ہوئے اور اُسے بیوی بنالیا، اِدھر جہانگیر احمد خاں پر غلام احمد خاں معتمد خاص کی بھتیجی سلطانہ بیگم عاشق ہوگئی۔ اور اس نے اپنی راہ سے کانٹے کو دور کرنا چاہا چنانچہ ایک جوگی بچے کی بھیس میں وہ جہانگیر احمد خاں کی مصاحبت میں تین چار ماہ رہی اور اپنی ہنر مندی سے اس عرصہ میں خوب پرچا بھی لیا، کیسری کا تعلق ایک دوسرے رئیس سکندر جاہ سے ہوگیا، سلطانہ بیگم بھی اس راز سے واقف ہوگئی تھی۔ لیکن مصلحتاً خاموش رہی۔ آخر ایک دن سکندر جاہ کو قتل کر کے جہانگیر احمد خاں کی صحبت سے غائب ہوگئی، اور اپنے گھر سے اس کا سر خوان میں رکھ کر کیسری

کے پاس خفیہ طور پر بھیج دیا، اس نامراد نے اپنے عاشق کا سر دیکھ کر ہیرے کی انگوٹھی سے خودکشی کرلی، آخر میں سلطانہ بیگم نے اپنا راز جہانگیر احمد خاں پر کھولا۔ اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلی۔

کرداروں میں ہیروئن سلطانہ بیگم کا کردار سب سے نمایاں ہے اور تابناک جرأت و شرافت کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں عشقِ صادق کا جذبہ بھی موجزن، جسکی وجہ سے وہ طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہے۔ ناول کا پورا پلاٹ اس کی قابلیت سے تیار ہوتا ہے، لیکن نواب جہانگیر احمد خاں کا کردار ارتقائی ہے۔ انھوں نے جوشِ جوانی کے تقاضے سے مجبور ہوکر کیسری کو محل میں داخل تو کرلیا لیکن بعد میں اس کے گنوارپن پر پچھتائے بھی بہت! چار دن کے بعد نشہ اترا تو اُن کی نسلی شرافت کے جوہر ظاہر ہونے لگے، وہ کیسری سے بیزار ہوکر جوگی بچہ کی طرف راغب ہوگئے، اور اس کے بعد آخر میں کیسری کی خودکشی پر بھی انہیں اتنا تاسف نہیں ہوا۔ جتنا جوگی بچہ کے بچھڑ جانے پر۔

نثر نگاری دلکش اور معتدل ہے، خصوصًا برسات اور بہار کے موسم کی مرقع کشی تو فردوس گوش معلوم ہوتی ہے، بیانات بھی ضروری اور مختصر ہیں، مکالمے فطری دلچسپ برمحل اور برجستہ ہیں۔ ناول میں ڈرامائیت کافی ہے، عشق وہی رسمی ہے، جو اب تک اردو ناولوں کی خصوصیت رہی۔ اور قصے میں واقعیت کم اور تخلیت زیادہ ہے، البتہ آغا شاعر کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے، پاکیزہ، شستہ اور رنگین اس پر روزمرہ اور محاورہ مستزاد، خصوصًا بیگماتی زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے 'پہلے باب

ہیں دوشیزہ کے خیالات کا اظہار اسکی بہترین مثال ہے، مصنف کو خود بھی دہلوی زبان پر ناز ہے، چنانچہ ناول کے آغاز میں ایک رئیس کے مصاحب کی زبان سے اس پر مفاخرت ظاہر کی ہے۔ اور لکھنؤ کے مقابلے میں دہلی کی فضیلت ثابت کی ہے۔

"ناہید" مصنف کا ایک ناولٹ ہے اسمیں دو پلاٹ ہیں ایک "ناہید" اور جہاندار کے معاشقے کا دوسرا جہاندار کی بہن اختر اور ناہید کے بھائی منجھو صاحب کی محبت کا، لیکن دونوں خاندانوں میں مخاصمت قدیم سے چلی آ رہی تھی، جب ناہید کے گھر میں آگ لگی تو جہاں دار نے اسے بچا لیا اور جشن صحت میں اپنی بہن اختر کے ہمراہ زنانہ لباس میں جا شامل ہوا، یہاں اسے ناہید سے اظہار محبت کا موقع مل گیا، لیکن افشائے راز پر ناہید تہ خانے میں ہاتھ پاؤں باندھ کر قید کر دی گئی، جہان دار کو یہ اطلاع ہوئی تو ناہید کو ایک رات وہاں سے نکال لایا۔ اور عقد کر کے کانپور، بنارس اٹاوہ، آگرہ، دہلی وغیرہ لئے پھرا، ادھر جہاندار کی بہن اختر منجھو صاحب پر عاشق ہو چکی تھی، جب اس نے ان کی بیماری کا حال سنا تو مردانہ لباس اختیار کر کے منجھو صاحب کی تیمارداری کرتی رہی، اور ایک دن انھیں زہر آلود دوا پینے سے روک کر خود غائب ہو گئی، منجھو صاحب کی صحت یابی پر اختر کی جانفشانی کا بھی حال کھلا تو پچھلے غبار دھل گئے۔ اور جہاندار کے ساتھ ناہید اور منجھو صاحب کے ساتھ اختر کی شادی ہو گئی۔

اس ناول میں بھی اعلےٰ طبقے کی سیرتیں پیش کی گئی ہیں، اختر کا ملازم

بن کر منجھو صاحب کی تیمارداری کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے "ہیرے کی کنی" میں سلطانہ بیگم کا جوگی بچہ بن کر جہانگیر احمد کی مصاحبت میں رہنا، جہاندار کا زنانہ لباس میں ناہید کے جشن صحت میں شریک ہونا بھی واقع کی بہ نسبت تخیل سے زیادہ تعلق رکھتا ہے، پھر کوئی ایک کردار بھی ایسا نہیں جو دیرپا یا دلچسپ ہو۔

ارمان" بھی ایک رومانی ناول ہے جس میں ایک خاندانی نزاع کے المناک نتائج دکھلائے ہیں۔ خورشید اور منظہر دونوں حقیقی بھائی ہیں اور مع اپنے اہل وعیال کے ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ لیکن باہمی نزاع کے باعث ایک پردہ ڈال کر گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے، خورشید کی کم سن لڑکی جوئی اور منظہر کا کم سن لڑکا ناصر دونوں ساتھ کھیلتے ہوئے جوان ہوئے انکی عمر کے ساتھ انکی محبت بھی بڑھتی ہے اوّل تو بچپن کی معصوم بے باکی اور آزادی یوں ہی جوانی کے تقاضے سے فطری شرم وحیا میں تبدیل ہو جاتی ہے، اس پر والدین کی باہمی چشمک ان پر اور کڑے پہرے بٹھا دیتی ہے، ناصر کے والدین بر بنائے مخاصمت اور جوئی کے والدین بنظر احتیاط وخوف رسوائی اپنی اپنی اولاد کو باہم دگر ملنے سے منع کرتے ہیں۔ اور دونوں کی باہمی محبت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی تغافل سے کام لیتے ہیں، چنانچہ جب جوئی کی شادی دوسری جگہ ہو جاتی ہے، تو ناصر زہر کھا لیتا ہے۔ اور جوئی موقع پاکر سسرال سے نکل بھاگتی ہے اور چاقو سے اپنا گلا کاٹ کر خود بھی ناصر کی آغوش میں گر پڑتی ہے۔ اس طرح خاندانی نزاع دونوں

کی قیمتی جانیں ضائع کرادیتی ہے۔

اس ناول میں بڑی چابک دستی سے متوسط طبقے کی خانگی معاشرت کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے جس اہتمام کے ساتھ دو معصوم دلوں میں محبت کا بیج بویا ہے اور جس نفسیاتی انداز میں اُن کی عمر کے ساتھ ساتھ اس ننھے سے پودے کو پروان چڑھایا ہے۔ وہ تاثیر، درد اور کسک میں آپ اپنی مثال ہے اولذکر ناول کی جملہ خوبیوں کے علاوہ اسمیں آغا شاعر کی حقیقت نگاری کا بھی کمال نظر آتا ہے، یہ ناول اپنے معصوم رومان کے دلکش آغاز اور فطری انجام، لطیف و بلیغ کنایوں اور نفسیاتی اشاروں، حقیقی مرقع کشی اور واقعیت نگاری، ڈرامائی اندازِ بیان اور کرداری ارتقا اور پُرتاثیر مکالموں اور اعلیٰ انشا پردازی کے باعث اردو ادب کا ایک نادر شاہ کار ہے۔

(منقول از "اردو ناول نگاری" مطبوعہ سنہ ۱۹۶۰ء)

شاعرِ عصر

مولانا سیماب اکبرآبادی

آغا صاحب، ایران کے معزز خاندانِ قزلباش سے ہیں؛ آپ کے آباد اجداد دہلی آکر مقیم ہوئے، وہیں آپ نے تعلیم و تربیت پائی اور جہاں استاد فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے، یہ اپنے استاد کے بڑے محبوب شاگرد تھے، اور فصیح الملک۔ آغا صاحب کی بے حد قدر کرتے تھے۔ مولانا حالی، ظہیر دہلوی، مجروح، طالب، ثاقب، مولانا شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد وغیرہ شعرا و علما نے آپکی ذہانت طباعی اور سلاست بیانی کا اکثر اعتراف کیا ہے، مشاعرے میں آپکی غزل خوانی قابلِ شنید ہوتی ہے، جوانی میں بقول شخصے آپ گریبانوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر داد لیتے تھے۔

آپ نے سب سے پہلے "اخبار وکیل" امرتسر میں ایڈیٹری کے فرائض انجام دیئے، تصانیف کا سلسلہ جاری رہا، پھر نواب بصیر الممالک مرزا شجاعت علی بیگ قونصل جنرل ایران کی مصاحبت میں رہے۔ اور "افسر الشعراء" کا خطاب پایا۔ جس کی لارڈ منٹو کی گورنمنٹ نے توثیق کی۔

حیدرآباد دکن کے دوسرے سفر میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بالقابہ نے ایک مقامی مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے نواب فصیح الملک کا خطاب (جہاں استاد) آغا صاحب کو عطا فرمایا۔ آپ کی تصانیف سے کئی کتابیں مشہور

مقبول ہیں ارمان، قتیلِ نظر، بلبلانِ فارس، خمکدۂ خیام، ہمارا آسمان، دامنِ مریم، شعلۂ جوالہ، پرپرواز، تیرونشتر، وغیرہ آپ نے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور ڈاکٹر نذیر احمد کے تراجم کلام اللہ پیشِ نظر رکھنے کے بعد کلام مجید کا فصیح اردو ترجمہ نظم بھی فرمایا ہے۔

افسانہ نگاری میں یگانہ، ڈرامہ نویسی میں فخرِ زمانہ، علم مجلسی اور اخلاق میں فرد، آزادیٔ وطن کے حامی اور قلم کے مرد ہیں۔ آپ نے ریاست جھالاواڑ سے ایک رسالہ "آفتاب" بھی جاری کیا تھا۔

آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت کافی ہے۔ قابلِ ذکر مشاہیر حضرات یہ ہیں۔ ڈاکٹر ظفرالحسن صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، دیوان شرر، مہاراج بہادر برق دہلوی، نواب شہید یار جنگ، نواب میر علی نواز تال پور ناز والیٔ خیرپور۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ۔

انسان کے کمال میں کسبِ ہنر بھی ہو
ہے پھول وہ ہی پھول کے مٹھی میں زر بھی ہو

معصوم چہرہ شرم سے نیچی نظر بھی ہو
ایسے نے دل لیا ہو، تو کون اُسکے سر بھی ہو

پھولوں کی سیج، چاند بھی ہو چاندرات بھی
اے انجمِ نجت، پھر کوئی ایسی سحر بھی ہو

ہنگامۂ حیات میں، گم ہو گیا ہوں میں
تیری خبر ہو کیا مجھے اپنی خبر بھی ہو

ہر صبح کو تو ح ہے یہاں، تیری تلاش میں
دُنیا ہیں، در بدر کا ترے کوئی گھر بھی ہو
کیوں کر نہ سمجھوں، خاک نشینوں پہ التفات
نیچی نظر ہے جب کبھی اُونچی نظر بھی ہو
شل ہو چکا، کشاکشِ قیدِ حیات سے
اب کیا اڑوں گا میں کوئی بازو میں پر بھی ہو

داغِ دل مٹتا نہیں ہرگز جِلا پانیکے بعد
شمع کا شعلہ بھڑکتا ہے، ہوا کھانے کے بعد
قبر کا سامان کر، فصلِ خزاں آنے کے بعد
خاک میں ملتا ہے سورج، سر سے ڈھل جانیکے بعد
کب سے گھائل کر رہی تھیں، آپکی آرائشیں
اب کہاں اُٹھ کر چلے؟ تصویر بن جانیکے بعد
موت سے تھا سخت وہ، یہ ہے قیامت سے سوا
آپ کے آنے سے پہلے آپ کے جانیکے بعد
پھر میسر کس کو آتی ہے جوانی کی بہار
پھول، کانٹے کی طرح کھٹکا ہے، مرجھانے کے بعد
اس نے جب انگڑائی لی، چمکا دیئے، دو، دو ہلال
قد آدم تھا اندھیرا، بال کھل جانے کے بعد

ہم سے پُوچھے کوئی آکر لذتِ آلام کو
کس قدر تسکین ہو جاتی ہے غم کھانے کے بعد

کیا خبر تھی، رازِ دل اپنا عیاں ہو جائے گا
کیا خبر تھی آہ کا شعلہ، زباں ہو جائے گا

رات بھر کی ہیں بہاریں، شمع کیا، پروانہ کیا؟
صبح ہوتے ہوتے رخصت کارواں ہو جائیگا

حشر ہونے دے ستمگر، ہم دکھادیں گے تجھے
پیارا پیارا یہ گریباں، دھجیاں ہو جائیگا

اس کو کہتے ہیں جہاں میں لوگ سچی اُلفتیں
تیر جب دِل سے کھچے گا تو کماں ہو جائیگا

حشر میں انصاف ہوگا، بس یہی سُنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائیگا

آڑھی سیدھی پڑتی ہیں نظریں تمہیں پر آج تو
مجمع تارِ نظر، کیا بدتھیاں ہو جائے گا؟

ہے یہی رنگِ سخن تو شاعرِ شیریں بیاں
تو بھی اک دن طوطیٔ ہندوستاں ہو جائیگا

اُنس اپنے میں کہیں پایا نہ بیگانے میں تھا
کیا نشہ ہے؟ سارا عالم ایک پیمانے میں تھا

اُس پرانی کاوشیں، یہ شور و شر، یہ اضطراب
ایک چٹکی خاک کی، دو پر، یہ پروانے میں تھا

آپ ہی اُسنے انا الحق کہدیا؟ الزام کیا؟
ہوش کس نے لے لیا تھا؟ ہوش دیوانے میں تھا

اللہ اللہ خاک میں ملتے ہی یہ پائے ثمر!
لو خدا کی شان، پھل بھی، پھول بھی، دانے میں تھا

شیخ کو جو پارسا کہتا ہے اسکو کیا کہوں؟
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا، وہ میخانے میں تھا

شاعرِ نازک طبیعت ہوں، مرا دل کٹ گیا
ساقیا، دینا کہ شاید بال پیمانے میں تھا

بھلا ہم کیا تجھے او ابروئے قاتل سمجھتے ہیں
سپاہی ہیں، چھری کو پیار کے قابل سمجھتے ہیں

اگر کوشش کرے انسان، تو کیا ہو نہیں سکتا
وہ بے ہمت ہیں، جو ہر کام کو مشکل سمجھتے ہیں

یہ دِل سی چیز لے کر، تم، ہمیں واپس بھی دیدوگے؟
نظر پہچانتے ہیں؟ ہم تمہارا دل سمجھتے ہیں۔

کسی کے ناز کی روٹھی سی اک تصویر ہے دل میں
جسے ہم مدتوں سے رونقِ محفل سمجھتے ہیں
وہ باسی ہار جو شب بھر رہا ہو تیری گردن میں
تمدید اسکی اک اک پنکھڑی کو دل سمجھتے ہیں
کمال اپنا نہیں شاعر زمانے کی یہ خوبی ہے
کہ اب وہ وقت ہے ناقص کو بھی کامل سمجھتے ہیں

آغا صاحب کے کلام کے نمونے جو آپ نے دیکھے وہ اس عمر کے نہیں ہیں۔ اب جبکہ آغا صاحب کا دل و دماغ تھک چکا ہے، اب وہ مدت سے اپنے متعلق "جنازۂ رواں" لکھا کرتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا۔ کہ آغا صاحب عالمِ شباب میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ نواب فصیح الملک کے شاگردوں میں جو فصاحت وسلاست اور شیوہ بیانی آغا صاحب کے کلام میں ہے وہ اُن کا حصہ ہے، خود فصیح الملک آغا صاحب کے کلام کی تعریف کیا کرتے تھے۔ عمرِ وسطیٰ کا کلام، موجودہ عمر کے کلام سے بہت زیادہ جوان ہے۔ مثلاً

پی پلا کر اُسے رحمت کی قسم دیتے ہیں۔
کیسے بندے ہیں کہ اللہ کو دم دیتے ہیں

یا یہ شعر۔ یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیا صورت بنی غم کی۔
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

اور ملاحظہ فرمائیے،

تمہارے حسن کی گرمی ہماری داستاں تک ہے
کہ جیسے آتشِ گلزار، بلبل کی فغاں تک ہے

مرا قصہ سُنا ظالم نے اور پھر ہنس کے فرمایا
جسے تم کہہ رہے ہو کیوں جی یہ قصہ کہاں تک ہے

ہزاروں سے سُنے یہ لفظ، لیکن لفظ تھے خالی
تمہاری بات کی شوخی، تمہاری ہی زباں تک ہے

دہلی کی ٹکسالی زبان جسے کہتے ہیں، وہ آغا صاحب کے کلام میں محفوظ ہے، پھر نظم و نثر دونوں میں ایک سی فصاحت اور ایک سی عذوبت پائی جاتی ہے۔ تغزل کا رنگ قدیم ہے۔ مگر خیالات میں جدّت اور تخیّل میں بلندی جا بجا موجود ہے، آغا صاحب نے قصائد میں بھی اپنی طبیعت کی روانی دکھائی ہے۔ ایک قصیدے میں فرماتے ہیں۔

جانتے ہو، مرے شاگرد ہیں بی اے، ایم اے
بلبلِ ہند کا شاگرد ہوں میں لاثانی

امیر مینائی لکھنوی کے شاگردوں میں ریاض مرحوم اور حضرتِ جلیل مانک پوری کے مقابلے میں آغا صاحب کا کلام رکھا جا سکتا ہے۔ مگر ریاض و جلیل کے یہاں لکھنویت زیادہ ہے، اور آغا صاحب اپنے کلام کے اعتبار سے دہلی اسکول کے ایک ناقابلِ مقابلہ ہیرو نظر آتے ہیں۔ آپ کے ہر شعر سے کہنہ مشقی اور سیر گوئی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

اس وقت بھی جب کہ ان کی عمر کافی ہو چکی ہے، وہ ہزاروں جوان العمر شعراء سے زیادہ اچھا کہتے ہیں۔ اور بہتر پڑھتے ہیں، اساتذۂ وقت میں ان کا شمار ہے اور وہ بجا طور پر شاعر عصر کہلانے کے مستحق ہیں،

آغا صاحب۔ صحیح معنی میں فصیح الملک مرحوم کے مقلد اور پیرو ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا داغ مرحوم کا رنگ جھلکتا ہے۔ آغا صاحب کے نام کے ساتھ ہمیشہ AUTHOR OF PURE URDU LITRATURE لکھا جاتا رہا ہے۔ اور وہ حقیقت میں اس منصب کے اہل ہیں۔

(منقول از شاعر آگرہ فروری ۱۹۳۶ء)

برادر مرحوم حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی صرف تخلص کے شاعر نہ تھے بلکہ حقیقی شاعر تھے، ان کی شاعری میں زندگی تھی۔ اور وہ شاعری میں زندگی کی ترجمانی کرتے تھے، دلی اسکول اور اسالیب داغ کی تبلیغ و نمائندگی آغا صاحب کا حصہ مخصوص تھا! انکی تمام زندگی خدمت ادب میں گذری ہے، میں نے انہیں اسوقت دیکھا جب وہ منزل شباب سے گذر چکے تھے لیکن جن لوگوں نے انکی جوانی دیکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ انکی غزل گوئی اور غزل سرائی دونوں قیامت تھیں۔ وہ جب اپنی بلند آواز سے للکار کر غزل پڑھتے تھے، تو مشاعرے کے درو دیوار لرز جاتے تھے، اور وہ بقول کسے لوگوں کے گریبانوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر داد لیتے تھے، بلند قامت بھرا ہوا بدن، رعب دار چہرہ، بڑی بڑی مونچھیں، کشادہ دامن عبا اور اپنے قد سے لمبا عصا لیکر جب وہ کسی مشاعرے میں داخل ہوتے تھے تو تمام شاعر کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے تھے" اور آغا صاحب آگئے" آغا صاحب آگئے"

کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہو جاتی تھیں، حیدر آباد دکن کے شاعروں میں ان کی جواں مرائی آج تک ایک حدیث یادگار ہے،

میں سب سے پہلے اُن سے اجمیر شریف میں ملا، جہاں وہ نواب شمس الدین علی خاں عاشق رئیس لُہارو کے مہمان تھے، نواب صاحب کو ریاست ٹونک سے تعلق تھا اور شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی، اجمیر شریف کے اکثر منتہی شعرا کی ان کے یہاں نشست ہوتی تھی۔ وضع قدیم کے پابند جوان العمر رئیس تھے، میں بھی ان کے ہاں اکثر حاضر ہوتا تھا، ایک دن گیا تو معلوم ہوا کہ آغا صاحب آئے ہوئے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد اُن سے نیاز حاصل ہوا۔ بڑے تپاک اور انتہائی خلوص سے ملے، اور اُن کا یہ خلوص پھر تمام عمر بڑھتا ہی رہا۔

اس دن ابر چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، دن کے ۹ یا ۱۰ بجے تھے، ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد آغا صاحب نے نواب صاحب کے کان میں کچھ کہا، مگر نواب صاحب نے اس راز کو راز نہ رکھا اور جواب دیا۔ کہ آغا صاحب یہاں نہیں آج تو ابر ہو رہا ہے، دولت باغ چلئے، وہاں لطف رہے گا۔ ارادے کی دیر تھی۔ فٹن تیار ہو گئی، نواب صاحب کے ایک مصاحب اور ہم تینوں ذرا سی دیر میں دولت باغ پہونچ گئے، اجمیر شریف میں یہی ایک باغ ہے جو شاہی زمانے کی یادگار ہے، آنا ساگر کے کنارے بہت بڑے طول و عرض میں آباد ہے۔

دولت باغ پہونچ کر ایک گھنے درخت کے نیچے سبزے پر ہم چاروں

بیٹھ گئے، وہ کچھ عجیب سماں تھا، جس کی یاد آج بھی ولولۂ شباب پیدا کردیتی ہے، خیر، نواب صاحب نے فرمایا ہاں آغا صاحب اس وقت ایک غزل نئی اور حسبِ موسم ہونی چاہیئے۔ کہنے کی دیر تھی آغا صاحب پنسل اور کاغذ لے کر بیٹھ گئے، چند منٹ گذرے تھے۔ کہ غزل تیار تھی، کہنے لگے، ہاں نواب صاحب مطلع سنیئے، خدا کی قسم آپ دس برس میں بھی ایسا مطلع نہیں کہہ سکتے، نواب صاحب ہنسے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ہاں آغا صاحب سنائیے تو۔ دس پندرہ منٹ تو آغا صاحب نے تمہید ہی میں لے لئے، اس کے اس کے بعد جو مطلع سنایا ہے تو حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم کیا سارا باغ جھوم گیا، اس زمین میں ان کی غزل مشہور ہے صرف مطلع سن لیجئے۔

پی پلا کر اسے رحمت کی قسم دیتے ہیں۔
کیسے بندے ہیں کہ اللہ کو دم دیتے ہیں!

جس وقت آغا صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ مطلع پڑھا، ہم لوگوں کی عجیب حالت تھی، اس کے بعد غزل کے چند اشعار سنائے، اور یہ صحبت کچھ دیر میں ختم ہو گئی۔

آغا صاحب کے کلام میں لطفِ زبان اور سلاستِ بیان کے ساتھ جو ایک قسم کی برجستگی اور شگفتگی ہوتی تھی۔ وہی ان کی شاعری کا امتیازِ خصوصی تھی۔

آغا صاحب باوجودِ کمالات اپنے اُستاد کے پرستار ہی نہیں عاشق بھی تھے، اور جو شہرت وقبولیت انھیں حاصل ہوئی وہ اسی ارادت اور

عقیدت کا نتیجہ تھی، اُستاد مرحوم کے انتقال کے بعد جب کبھی آغا صاحب ان کا ذکر کرتے تھے۔ یا سنتے تھے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی تھیں اور آواز میں گرفتگی پیدا ہو جاتی تھی، فصیح الملک کی وفات پر ان کی نظمیں اور مقالے آج تک یادگار ہیں۔ ایک غزل کے مقطع میں کس انداز سے فرماتے ہیں

کہاں اُستاد سا اُستاد، شاعر مرتے ہم تو
فلک سو سال چکر کھائے جب ایسا سخن ور ہو

وہ جب اپنے منصبِ شاعرانہ کی بلندی دکھاتے تو اپنے اُستاد کی عظمت کا بھی خیال رکھتے تھے،

جانتے ہو مرے شاگرد ہیں بی۔ اے ایم اے
بلبلِ ہند کا شاگرد ہوں میں لاثانی۔

میں نے ایسا فنا فی الاستاد شاگرد نہیں دیکھا، غزل ہو، نظم ہو، قصیدہ ہو، غرض کچھ ہو مگر اپنے استاد کو یاد کرنا نہیں بھولتے۔

غزل گوئی کوئی شے ہی نہیں تو یہ کرو شاعر
اگر کچھ لطف ہے تو بلبلِ ہندوستاں کا سے ہے

آغا صاحب کی شاعری میں دہلی کی ٹکسالی زبان کے بلند ترین شاہکار موجود ہیں، ان کی رباعیات، ان کے قطعات، ان کی غزلیں، زبانِ اُردو کے لطائف سے بھری پڑی ہیں، اگر ان کا کلیات شائع ہوا تو وہ اس دور کی منجھی ہوئی اور سلجھی زبان کا بہترین نمونہ ہوگا۔

آغا صاحب تمام اصنافِ سخن پر حاوی تھے، ناول بھی لکھے، ڈرامے بھی لکھے، عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ نہایت دلکش پیرائے میں کیا۔ اور اپنی قادر الکلامی کا معجزہ دکھانے کے لئے قرآن مجید کے ترجمہ کو بھی منظوم کر دیا۔

مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے، خُلق اور خلوص بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا! مجھ سے جب کہیں ملے، دوڑ کر گلے لگا لیا! دعائیں دیں اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ آخر عمر میں بہت رقیق القلب ہو گئے تھے اور خود کو جنازۂ رواں لکھا کرتے تھے۔ افسوس کہ فصیح الملک مرحوم کا یہ پہلوان سخن ایک عرصے تک بیمار رہ کر بتاریخ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء بروز سہ شنبہ دنیا سے رخصت ہو گیا، اور اپنا رنگِ سخن بھی اپنے ساتھ لے گیا مرحوم کے مزار کے لئے میں نے جو قطعاتِ تاریخ لکھے تھے انہیں پر اپنے مضمونِ مختصر کو ختم کرتا ہوں۔

ہو الباقی

۱۲ مارچ کو منگل کے دن	اُٹھ گئی خاکِ آغا شاعر
ہے ساری دنیائے ادب میں	رنجِ ہلاکِ آغا شاعر
مطلعِ صبحِ شعر و سخن تھا	سینہ چاک آغا شاعر
دل میں درد اور آنکھ میں آنسو	آہ تپاکِ آغا شاعر

کلبۂ غم سیماب نے لکھا
مرقدِ پاکِ آغا شاعر

۱۹۴۰ء

آں شاعرِ بے بدل، قزلباش | گویند کہ شد نصیبِ فردوس
قبلِ مغرب دوازدہُ مارچ | بد نغمہ فشاں قریبِ فردوس
تلمیذِ عزیزِ بلبلِ ہند | ہم شیوہ عندلیبِ فردوس
بد زمرۂ زبدۂ مشاہیر | باشد کہ شود خطیبِ فردوس

سیمابؔ نوشت سالِ رحلت
آغا شاعرؔ ادیبِ فردوس

۱۹۴۰ء (منقول از چمنستان مارچ سنہ ۴۱ء)

دلّی کے نامور نثار اور شاعر

علامہ شبلی نعمانی

آغا شاعر صاحب دلّی کے نامور نثار اور شاعر ہیں، اُردو زبان داں اِن سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے، اس خصوصیت کے علاوہ کہ اُردو ئے معلّی اُن کی مادری زبان ہے، اُن کو لٹریچر اور انشا پردازی کا خاص مذاق ہے۔ اُن کی نثر نہایت صاف، شستہ اور بے تکلف ہوتی ہے، شاعری میں بھی کمال حاصل ہے، خیال بندی کے ساتھ بندش کی صفائی اور برجستگی اور روزمرّہ محاورات کا نہایت عمدگی سے استعمال ان کے کلام کا خاص جوہر ہے،

(مولانا کے ایک خط سے اقتباس)

از حیدرآباد دکن

آغا صاحب

شوکت تھانوی

ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ لکھنؤ میں ملاقات ہوئی، دہلی میں مہمان تھا۔ لہٰذا جان بچ گئی تھی، لکھنؤ میں میزبان تھا لہٰذا ہر مشاعرہ معتوب ہو کر رہا۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسا پڑھنے والا نہیں دیکھا، ایک طوفان کا منظر، ایک زلزلے کا عالم، ایک بم پھٹنے کی کیفیت، مگر بلا کا اثر، سننے والے اثر بھی لیں اور سہم بھی جائیں، شعر پر جھومنے کو دل چاہے تو بھی دم سادھے بیٹھے رہیں۔

خدا بخشے مرحوم کہنے خوب تھے، مشق کے ساتھ جدت بھی کافی تھی، رسالوں میں کلام پڑھ کر زبانی سننے کا اشتیاق ہوا تھا، زبانی سن کر عافیت اسی میں نظر آئی کہ رسالوں ہی میں پڑھ لیا کریں گے۔

خاکسار سے بہت شفقت فرماتے تھے، محبت بھرے خطوط لکھتے تھے، مگر انڈسٹریل ایگزیبیشن کے ہندوستان گیر مشاعرے میں جو بگڑے ہیں تو خاکسار سکریٹری صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو وہ مزہ چکھایا ہے کہ آج تک آواز کی گرج دل دہلائے ہوئے ہے۔

(منقول از "شیش محل")

شاعرِ نامدار

مولانا صفی لکھنوی

تھے شاعرِ نامدار، آغا شاعر
اعلیٰ مضمون نگار، آغا شاعر
دلّی کا چمن ہرا بھرا تھا اُن سے
اس باغ کی تھے بہار، آغا شاعر

رسالہ چمنستان دلّی مارچ ۱۹۴۱ء

پیتا سمان

شیش چندر طالب دہلوی

جہاں استاد افسر الشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش کی وفات حسرت آیات پر ملک کے مختلف علمی ادبی، رسائل و جرائد نے آپ کے کلام بلاغت نظام پر مختلف نظریوں سے روشنی ڈالی، ملک کے بہترین مفکرین نے جو پیغام تعزیت دیئے اور جن الفاظ میں آپ کو یاد فرمایا وہ گویا آپ کے خلوص اور کمال کا اعتراف ہے، علاوہ ازیں بے شمار انجمنوں اور ادبی اداروں کے ماتحت جو ماتمی ریزولیوشن پاس ہوئے اور جو تقاریر ہوئیں ان سے بھی آپ کے حالات سے کماحقہ، واقفیت ہو جاتی ہے۔ میں آپ کو ایک نئے انداز سے روشناس کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔

دُنیائے تغزل میں جو آپ کا مرتبہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے، سورج کو چراغ دکھانا کیا ضرور؟ میں کوشاں ہوں کہ آپکی رباعیات منظومات اور اسی نوع کے دیگر کلام کے متعلق عرض کروں۔

یہ درست ہے کہ ہر شاعر کا ایک خصوصی رنگ ہوتا ہے لیکن جوہر قابل ہونا شرط ہے، کمال نہ تو مشکلات کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ کبھی ناقدری زمانہ کے ہاتھوں ناپید یا پسپا ہوا ہے پھر حضرت آغا شاعر مرحوم جیسی جامع کمالات ہستی جس کے متعلق پروفیسر حامد حسن قادری

کا رشاد ہے اور بالکل بجا ارشاد ہے، کہ "آغا شاعر کی وفات سے گویا ایک نہیں کئی ہستیاں ایک ساتھ اُٹھ گئیں، قوم کا محترم، قدامت کا نمونہ، دلّی کا زباں داں، شاعری کا اُستاد، داغ کا جانشین"

آپ کی چند رُباعیات پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے،

در کھول کوئی، کھولنے والا ہے تُو
رستہ کوئی دے جگت اُجالا ہے تُو
میں ہاتھ کسی ہاتھ میں کب دیتا ہوں
سب خاک بس ایک رہنے والا ہے تُو

تسلیم کہ خیال نیا نہیں، لیکن طرزِ اسلوب بے نیازِ ستائش ہے۔ عام فہم زبان، دلنشیں خالص ہندوستانی، مثلاً "جگت اُجالا" جیسی تراکیب اور ایک صریح حقیقت کا بیان، بہ لحاظ تاثر، کلام کو کیا نہیں بنا دیتا۔ کون سخت دل ایسا ہوگا جس پہ اِس رباعی کے مطالعہ کے بعد دُنیا کی بے ثباتی واضح نہ ہو جائے۔ در کھول کی اپیل، کس دل کو متاثر کئے بغیر رہ سکتی ہے؟ رُباعی کی تیسرا مصرع آپکی اٹل راسخ الاعتقادی کی بیّن دلیل اور آخری مصرع "اللہ بس باقی ہوس" کی مکمّل اور جامع تفسیر، کوزے میں دریا کیونکر بند کیا جاتا ہے۔ اگر یہ دیکھنا مطلوب ہو تو مندرجہ بالا رُباعی پر ایک نگاہِ غائر ڈالیں۔

دُنیا کی طلب نہ کر، یہ خرابائی ہے
یہ مانگنے سے، اور بہک جاتی ہے۔

دانا ہے تو کر، اصل کی جانب کو رجوع

دین آئے، تو دُنیا بھی چلی آتی ہے

اس رباعی سے اخذ شدہ نتائج کی تائید میں تواریخِ عالم کے صفحات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ دُنیا کے عنوان سے آپنے ایک اور رباعی بھی مرحمت فرمائی ہے کس قدر سچی بات کہہ گذرے ہیں۔

اعمال کی ہر شکل کو لیتی ہے یہ

بہتا ہوا دریا نہیں رہتی ہے یہ!

جو آج یہاں بوؤ گے، کل کاٹو گے

دُنیا نہیں عاقبت کی کھیتی ہے یہ

اور یہ حقیقت بھی ہے، میرے نزدیک دنیا کی صحیح تعریف بجائے دارالمحن کے دارالعمل ہے، اور دوسری دُنیائے عاقبت، دارالجزا،

مندرجہ بالا رباعی سے میرے اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے، اور یہ خیال اور بھی مستحکم ہوتا جاتا ہے،

باطن میں تو ہر سانس کا دم ساز ہے تو

کھلتا نہیں ظاہر میں، عجب راز ہے تو

اے کاش دمِ جرم کوئی پہچانے

جو دل سے نکلتی ہے، وہ آواز ہے تو

اس اے کاش کے قربان جائیے، یہ آواز انسان کو گناہ سے باز رکھنے کی کوشش تو کرتی ہے، لیکن جب وہ اس کی جانب دھیان نہیں کرتا تو

رفتہ رفتہ کمزور پڑتی چلی جاتی ہے۔ اور انسان قعرِ مذلت میں گرتا چلا جاتا ہے، اس پر بھی یہ سخت جان واقع ہوئی ہے، ایک وہ لمحہ انسان کی زندگی میں ضرور آتا ہے جبکہ وہ اپنے ہی ضمیر کے روبرو پشیمان اور اپنی ہی نظر میں شرمندہ و حقیر ہوتا ہے۔ کہ کاش اُسنے دمِ جرم کی اس آواز کی اہمیت کو محسوس کیا ہوتا۔

ہندو مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مِل جاؤ جو آپس میں تو مشکوری ہو
آجاؤ قریب تاکہ دوری ہو۔
کُھلتا ہے اکیلے سے کہیں بابِ قبول؟
دو ہاتھ ملاؤ کہ دعا پوری ہو

اس رباعی کی تکمیل میں طرزِ ادا کو بہت بڑا دخل ہے، بندش کی خوبی اور بالخصوص رباعی کے تیسرے اور چوتھے مصرعوں نے بالحاظ تاثیر کے اس کو اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں، ندرت پسندی اسی کا نام ہے،

میں کس کو کہوں، کون مسلمان نہیں؟
اتنی مری ہمت، مرا امکان نہیں
نیرنگِ زمانہ سے کھلا یہ شاعرؔ
عالم تو ہزاروں ہیں، پر ایمان نہیں

ایک تلخ حقیقت پیشِ نظر ہے، توفیق ہو تو شاعر کی اخلاقی جرأت کی داد دیں اور ہو سکے تو مائل بہ اصلاح ہوں۔

شاعروں کو بالعموم بے دین کہا جاتا ہے اور اُن پر کفر کے فتوے صادر کئے جاتے ہیں، دل پر ہاتھ رکھ کر بہ نظرِ انصاف مندرجہ ذیل باعیات کا مطالعہ فرمایئں، ممکن ہے آپ کو تبدیلیٔ رائے پر مجبور ہونا پڑے۔

کاجبل کی جو کوٹھری میں شفاف رہا
محبوبِ نام تر اقساف سے ناداف رہا
ہر جرم سے ہو جائے گی آسان نجات
مالک سے معاملہ اگر صاف رہا

ہر شخص کا دعوے ہے کہ حامی تو ہے
بدنام کنندۂ نکونامی تو ہے۔
اچھوں کے ہیں سب مجھ بُرے کا ہے کون؟
اللہ، گنہگار کا حامی تو ہے۔

اِسی رَو میں آپ فرما گئے ہیں،

دُھندلی ہے نظر، نگاہ کرتے کرتے
تاریک ہے رُو، سیاہ کرتے کرتے
یارب مجھے اب دامنِ رحمت میں چھپا
میں تھک گیا ہوں گناہ کرتے کرتے

رباعی کا یہ تیسرا مصرعِ آپ کی بخشش و مغفرت کے لئے کافی ہے، خدا آپ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

حضرتِ شاعر کے مشاہدات ملاحظہ فرمائیے،

یکساں کوئی فطرت میں بھلا ہوتا ہے؟
ہر دو میں جو ہے ایک جدا ہوتا ہے۔
آنکھیں ہوں تو گلہائے جہاں کو دیکھو،
ہر پھول نیا، رنگ نیا ہوتا ہے

کب قرب سے وقعت کی نظر ہوتی ہے
کب آنکھ کو پتلی کی خبر ہوتی ہے
شاعر یہ مرا قول ہے پتھر کی لکیر
دوری ہی سے کچھ قدرِ بشر ہوتی ہے

ان حقائق سے ہم آپ سب آشنا ہوتے ہیں، لیکن ان کے اظہار کی قدرت مخصوص طبائع کو ودیعت ہوتی ہے، کیا اب بھی یہ کہنا باقی رہ جاتا ہے کہ فیضانِ قدرت سے آپ کو خاص حصہ ملا تھا، اور آپ فی الواقع حقیقی معنوں میں شاعر تھے،

ہم مرد ہیں ابرو پہ نہ بل ڈالیں گے
اس قیدِ علائق کو کچل ڈالیں گے۔
کیا موت کا ڈر؟ موت کی سختی کیسی؟
میلی ہے یہ پوشاک بدل ڈالیں گے

یہ رباعی گیتا کی تعلیم کے مفہوم کے مطابق ہے اور مسئلہ تناسخ پر

روشنی ڈالتی ہے ساتھ ہی ساتھ اس سے جہاں ایک طرف آپ کا ذوقِ تجسس ظاہر ہوتا ہے وہاں آپ کی بے تعصبی اور وسیع النظری کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ آپ کس فراخدلی سے مختلف عقائد اور مخالف نظریوں کو اپناتے ہیں، یہی نہیں، اس رباعی کے مطالعہ سے تحریکِ عمل بھی ہوتی ہے اور کون نہیں جانتا کہ اس جنسِ کمیاب کی فی زمانہ ہماری سوسائٹی کو کس قدر ضرورت ہے

غیبت کا سبب خبر سے ہوتا ہوں میں
ہنستے ہیں سیہ قلب، جو روتا ہوں میں
ہو چشمِ بصیرت تو نظر کچھ آئے
کیا کیا درِ شہوار پروتا ہوں میں

شورش مری، گو دل کو نہیں بھائیگی
سُن لو کہ پھر آواز نہیں آئے گی
اب بھی مرے نغموں کو غنیمت جانو
نے کٹتے ہی جنگل سے چلی جائے گی۔

صحبت نہیں، تکرار نہیں، طول نہیں
نافہم کا قائل ہوں، یہ معقول نہیں
خود شعر مری داد دلا دیتا ہے
جو آپ مہکتا نہیں، وہ پھول نہیں

یہ صاحبِ فن کا اعجاز ہے نہ کہ سامعین کی سخن فہمی کی دلیل، اس رباعی کے آخری مصرع سے معلوم ہوا یہ مفہوم دیگر تماثیل کے ذریعہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے، جدتِ طبعی اسی کو کہتے ہیں۔

آپ کی چند مذہبی رباعیات بھی نقل کرتا ہوں۔ ارادتاً کسی تبصرے سے گریز ہے کہ ناظرین کا ذوقِ مطالعہ تشنہ نہ رہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

- مداحِ ریاضِ شہ عالی ہوں میں
غارت گرِ اصنام خیالی ہوں میں
گلہائے مضامیں سے معطر ہے یہ بزم
اِن پھولوں میں "ملتی ہوئی ڈالی ہوں میں"

- ہاں عرشِ معظم کے ستارے ہیں حسینؑ
سرکار کا دربار سنوارے ہیں حسینؑ
جو کچھ تھا وہ سب دیدیا معبود کے نام
اس واسطے "اللہ کے پیارے ہیں حسینؑ"

مندرجہ بالا رُباعی سے حضرت جوش نے اکتساب کیا۔ جس کا انہوں نے دلی کی بھری مجلس میں اعتراف بھی کیا۔

- تخصیص نہیں، پیر و جواں بھی جائے
مومن کو ثواب ہے وہ جہاں بھی جائے
بتخانے میں ہوتا ہو اگر ذکرِ حسینؑ
لازم ہے کہ سر کے بل وہاں بھی جائے

- جو وقت معین تھا، وہ ٹلنے نہ دیا!

تقدیر نے پہلو بھی بدلنے نہ دیا

سہری ہوئی تلوار کے پھل سے شاعر

سجدے میں نمازی کو سنبھلنے نہ دیا

- یہ ضد نہیں، ماہتاب کر دینا مجھے۔

یا غیرتِ آفتاب کر دینا مجھے

میں خاک جو ہو جاؤں تو اے ذرہ نواز

خاکِ درِ بوتراب کر دینا مجھے

نہ جانے کن حالات ناسازگار اور کس ماحول سے متاثر ہو کر آپ نے درج ذیل رباعی فرمائی۔

- مدت ہوئی پابندِ محن رہتا ہوں

بیمار ہوں مشتاقِ کفن رہتا ہوں

گذرا وہ بہاروں کا زمانہ شاعر

اب قلب کے داغوں سے چمن رہتا ہوں

انکساری کا عالم ملاحظہ کیجئے۔

- حریفِ بدر نہ غیرتِ مہ کمال ہوں میں

خیال یہ ہے کہ ایک پیکرِ خیال ہوں میں

نہ کوئی ناز ہے شاعر نہ ادعا ہے مجھے

خدا پہ خوب ہے روشن کہ بے کمال ہوں میں

یہ سچ ہے۔ ع

جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ آپ کے غیر مطبوعہ مجموعہ کلام ہیں قومی، ملّی، ادبی، منظریہ، تواریخی۔ غرضکہ ہر رنگ کی نظمیں ملتی ہیں'۔ فی الواقعی آپ نے شاعری اور حقیقی شاعری کا حق ادا کر دیا، آپ کی آخری نظم بندے ماترم جیسی ایک اور نظم" سے اقتباس درجِ ذیل ہے:-

پیاری ماتا تجھ کو سلام بھارت دیوی کو پرنام
ہندو مسلم سکھ عیسائی ہم سب تیرے لال ہیں مائی
مل جل کر سب ایک ہوئے ہیں تیرے در کے بھگت بنے ہیں
پیاری ماتا تجھ کو سلام بھارت دیوی کو پرنام!
بھیم اور ارجن جاتی ماتا لمبے برچھوں والی ماتا
ویر تھے تیرے کیسے کیسے شاہ جہاں اور اکبر جیسے
پیاری ماتا تجھ کو سلام بھارت دیوی کو پرنام
نرمل جل، پھل، پھولوں والی سورج چاند ستاروں والی
تیرا پربت سب سے اونچا سنتری تیرا جگ رکھوالا
پیاری ماتا تجھ کو سلام بھارت دیوی کو پرنام

نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ یہ بندے ماترم کا ترجمہ نہیں بلکہ ایک آزاد نظم جو انہیں LINES پر لکھی گئی ہے، اردو شعرا کے دیوان پر دیوان ملاحظہ فرماتے جائیں ۔ آپ کو ہندی اور سہل

زبان کا اتنا بڑا ذخیرہ کہیں نظر نہ آئے گا، یہ الفاظ اس سلیقے سے منظم کئے گئے ہیں۔ کہ غیر مانوس یا بار نہیں معلوم دیتے، بخلاف اس کے جہاں نظم میں ایک طرف غضب کی شیرینی اور حلاوت پیدا ہو گئی ہے۔ وہاں دوسری طرف اسکی تاثیر بھی کئی گنا بڑھ گئی ہے، اگر ہمارے دیگر شعرا اور ادیب حضرات بھی آپ کی تقلید میں قلم اٹھائیں تو اردو ہندی کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے؟ اور ہم ایک ایسی لنگوا فرنیکوا بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جس پر صحیح معنوں میں ان الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے،

سرزمین ہند کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں۔

زمینِ ہند تُو، خود ہی جواب ہے اپنا
کہ تیری خاک سے کرتا ہے مہر کسبِ ضیا
اندھیرا چین میں جب تھا، سیاہ تھا یونان
تو آفتاب ترے علم کا درخشاں تھا
رواں ہے آج تلک جن کا نام گنگ و جمن
یہیں تو بہتے ہیں وہ، سونے چاندی کے دریا
لئے پھرے کوئی اٹلی کے لالہ زاروں کو
مگر وہی کہ جو کشمیر تک نہیں پہونچا
زمین کے تختے پہ یہ آم تو دکھائے کوئی
نباتِ مصر کا ہو جائے جس سے منہ میٹھا

یہاں کے چھتری مشہور تھے زمانے میں
یہ سچی بات ہے رَن بھوم اُن کا تھا باسا
وہ ایسی دیویوں کی گود سے چڑھے پروان
کہ جن کے شت کا ہے اب تک جہان میں چرچا
یہ راجپوت کا تھا دھرم، ماں یہ کہتی تھی
لڑائی سر پہ ہے، جا، میرے لال جنگ کو جا
تجھے خبر ہے کہ مرتے ہیں کس طرح رجپوت
یہ جانتا ہے کہ ساونت کا ہے کیا بانا؟
سدھار ہاں مرے پیارے یہ رن ہے اور وہ سورگ
یہیں سے کھینچ لے، خاراشگاف، برق ضیا
کبھی نہ پیٹھ پھرانا، جو میرا لال ہے تُو
کہ شیر جا کے پلٹتا نہیں کبھی اُلٹا
وہ جنگ کرنا کہ چلّا اٹھیں یہ سب شاعر
یہی بلی ہے، یہ ساونت ہے، یہ ہے جُودھا

" دکھیا بھارت" کے عنوان سے ذیل کی نظم پیش ہے۔ جو شائع ہوتے ہی اس وقت کی حکومت نے ضبط کر لی تھی، اور مختلف صورتوں میں آج تک مشہور ہے۔

وہ اسیرِ دامِ بلا ہوں، جسے سانس تک بھی آ نہ سکے۔
وہ قتیلِ خنجرِ ظلم ہوں، جو نہ آنکھ اپنی پھرا سکے

مجھے آسماں نے مٹا دیا، مجھے ہر نظر سے گرا دیا۔
مجھے خاک ہی میں ملا دیا کہ نہ ہاتھ کوئی لگا سکے

مری دشمنی پہ ہزار ہیں، بھرے خاطروں میں غبار ہیں۔
مرے دل میں زخم ہزار ہیں، اُبھیر، کیونکہ کوئی دکھا سکے

مرے سورمیر کہاں گئے، مرے قلعہ گیر کہاں گئے
وہ مہ منیر کہاں گئے، جو کبھی پلٹ کے نہ آ سکے

مرا ہندوکش ہوا ہندوکُش، وہ ہمالیہ ہے دیوالیہ
مرے گنگا جمنا اُتر گئے، بس اب اتنے ہیں کہ نہا سکے

نہ وہ دلی ہے نہ وہ آگرہ نہ وہ سندھ ہے نہ وہ کلکتہ
جو نگر ہے، اُجڑا پڑا ہوا نئے سر سے کون بسا سکے

مرا تخت جس پہ کہ مور تھا، وہ جہاں میں جبکہ کہ شور تھا
اُسے چھین چھان کے لے گئے، یہی زور اپنا جتا سکے

مرا کوہِ نور بہا دیا، اُسے ٹکڑے کر کے اڑا دیا!
مجھے ہر طرح سے مٹا دیا کہ نظر میں پھر نہ سما سکے

مرے اونچے اونچے جو کوٹ تھے، وہ کھنڈر میں آج پڑے ہوئے
وہاں اُلّو آ کے ہیں بولتے، جہاں باز پر نہ ہلا سکے

مرے بچے بھیک ہیں مانگتے، انھیں ٹکڑا روٹی کا کون دے
جہاں جائیں، کھوں پرے پرے کوئی پاس تک نہ بٹھا سکے

نبجے شاعر اسکی ہی بانسری نہ رہے گی نہ بجے راہی
یہ بڑی پھسلنی زمین ہے، یہاں کون پاؤں جما سکے

استغاثۂ مسلم بحضور سرور کائنات کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

غارِ حرا کے گوشہ نشیں، اُٹھ کے دیکھ تو
کیا حال اندنوں ہے تیرے دینِ پاک کا
اسلام کو ڈبو دیا، خود اہلِ دین نے!
گو آسماں پہ اُڑتا ہے، یہ پُتلا خاک کا
آپس کے میل جول میں، رخنے ہزار ہیں۔
ہے کفر سے ملا ہوا، دامن تپاک کا
منبر پہ ہے نشست، مگر مشرکین کی!
آہنگ مسجدوں میں ہے، آفس کلاک کا
ملت فروش، تھیلیاں بھرتے ہیں رات دن
ننھا بھتیجا بھی، ہے چچا، شائیلاک کا
قول و قرار آج کل ہیں، پھسپھسی سی بات
جھوٹ اسقدر سفید ہے، منہ جیسے چاک کا
روزہ نماز، قصہ ہیں، اب فرض کچھ نہیں
ارکانِ دین، ایک گھروندہ ہیں خاک کا

پھرتے ہیں ساتھ ساتھ، بہو بیٹیاں لئے
عالم میں ایک شور ہے پردے کے چاک کا

مورِ ضعیف کے نام سے حقیر ننھی منھی چیونٹی پر جو نظم ہے اُس کے چند بند قابلِ توجّہ ہیں۔

خدا کی شان تو دیکھو، کہ ایک مورِ ضعیف
میں اُسکے ذوقِ کشاکش کی کیا کروں تعریف
یہ ایں قوائے نحیف و نزار و زار و نحیف
پہاڑ سامنے ہو، تو کہے، مزاج شریف
نظر کا نقش جہاں ہے، اُچٹ نہیں سکتا
قدم ہے سُست، مگر، بڑھ کے، ہٹ نہیں سکتا

جو پانی آئے تو تنکوں کا پُل بنا کے بڑھیں
ملے ذرا سی کگر بھی، تو، ڈگمگا کے بڑھیں
ہزار فصل پہ ہو فصل، پھیر کھا کے بڑھیں
نہ ہو جو راہ، سرنگیں لگا لگا کے بڑھیں
یہ ایک ایک جری، خیل سے نہیں رکتا
کہ جیسے، شیر کا مُنھ، سیل سے نہیں رکتا

گرا ہی پڑتا ہے، ایک ایک پر کہ ہم پہونچیں
مقابلے میں لگا دیں، جو لاکھ ہوں جانیں

کمانڈر کوئی انکا سا لائے تو دیکھیں
ذرا سی آڑ پکڑ کر اتار دیں فوجیں
مجال کیا کہ جو مقصد سے کوئی ٹل جائے
یہ پھیر ہے کہ جو پاتال تک نکل جائے

ایک تاریخی واقعے کو نظم کرتے ہوئے مہارانا پرتاپ کے ضمن میں یوں رقم طراز ہیں۔

رانا پرتاپ یوں گھرا دل میں — چاند چھپ جائے جیسے بادل میں
ساتھیوں نے وہ کچھ کیا ساکھا — ہلدی گھاٹ آکے ایک بھی نہ پھرا
جتنے ہرن بیر تھے وہ کھیت رہے — بچھ گئے سب وہیں پرے کے پرے
یہ چیتک کو اڑا کے جا پہونچا — عین ہودے پہ جو کہ بیچ میں تھا۔
شاہزادہ سوار تھا جس پر — جس کو گھیرے ہوئے تھے اہلِ وفا
ایسی گھمسان کی لڑائی تھی — یہ کٹا وہ چھٹا، وہ صاف ہوا
سنناتے تھے تیر کانوں میں — اور شپاشپ تھی تیغ کی ہر جا
رانا مرنے پہ چست، زیست سے سیر — برچھا تانے ہوئے جدھر جھپٹا
کھاکے مہمیز آگ تھا رہوار — پتلیاں جھاڑتا ہوا لپکا
کاٹ ڈالا صفوں کو دم بھر میں — سامنا صاف کر لیا اپنا
ایک ہی جست میں تھا ہاتھی پر — اور چیتک ہو گیا الف پورا
پتلیاں دونوں رکھ دیں مستک پر — بڑھ کے برچھے کا زن سے وار کیا

بچ گئی جان شاہزادے کی ‌‌‌‌‌‌‌‌ پنچ میں کام آگیا ہودا
رن پکار اٹھا آفریں سو بار
واہ رے مرد، واہ رے گھوڑا

ان جملہ اقتباسات کی چال، خلوص بیان، دلکش طرزِ ادا، سادہ بیانی، عام فہم الفاظ کا انتخاب، روزمرہ، ہندی تراکیب کا بناؤ ہے اور خصوصیت بھی ہلدی گھاٹ کے واقعے کو ایسے بے لاگ پیرائے میں منظم فرمانا اور مہارانہ پرتاپ کی جرأت و مردانگی کی یوں کھلے دل سے داد دینا، آپ کی بے تعصبی، وسیع النظری اور فراخدلی کی بیّن دلیل ہے، وہ جنہیں گمان ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو ابھی تک اپنا وطن تسلیم نہیں کیا ہے اور عرب و عراق ہی کے خواب دیکھنے کے عادی ہیں، انھیں اِن اقتباسات کو بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اردو ہندی کے مسئلے میں یوں فرماتے ہیں۔

غلط یہ دھیان ہے کرنا پڑے گا ردِّ عمل
مٹے گی آج نہ اردو، نہ مٹ سکے گی کل!
زبانِ ہند ہے، بھاشا کا مہریہ ہے آنچل
اسی میں غرق ہیں، گنگ و جمن کے دَل بادل
مہابلی ہے یہ، ہر روپ اختیار میں ہے
یہی تو کاشی میں، متھرا میں ہردوار میں ہے

بند کے آخری مصرع میں جس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کیا اُس سے

انکار کیا جا سکتا ہے؟ وہاں کے ایک محدود طبقے کی زبان جانے دیں۔ عام بول چال کیا ہے؟ اور اسکا صرف ایک جواب ہے اور وہ ہے۔ ہندوستانی' اردو ہندوستانی ہی کو کہتے ہیں'۔ ناظرین کو غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہیئے ایک بند کی ٹیپ ملاحظہ فرمائیے۔

اسی کو سیکھنا اب، والمیک نیک اشاس
اسی کو بولتا، زندہ جو ہوتا کالی داس

زمانۂ نو سے شاعر کی مؤثر اپیل پر دھیان دیں، فرماتے ہیں۔

کہاں سے لائیں گے ہم، اپنے میرؔ و سوداؔ کو
کہاں سے پائیں گے جرأت کو سید انشاؔ کو
کہاں سے لائیں گے مومنؔ کو ذوقِ یکتا کو
کہاں سے پائیں گے غالبؔ کے خوانِ یغما کو
غضب کا دکھ ہے، بڑا دکھ ہے آپ لوڈ یٹ نہ دو
نہ چھوڑو ہندی کو اردو کو بھی تو میٹ نہ دو

ہندو حضرات نے اردو ادب کی جو خدمات کی ہیں۔ ان کے اعتراف میں فرماتے ہیں۔

بہت تھے طوطیٔ ہندوستاں؟ اڑاتے ہو
نسیمؔ لکھنوی کی کوشش مٹاتے ، ہو
رتنؔ بھی ایک ہی سرشار بھولے جاتے ہو
وحیدِ عصر نھے چکبستؔ، تم چھپاتے ہو

یہ سب ستم تجھے طوطیٔ شکر دہن پکار تو لو

جو ان کے تم پہ ہیں احسان، وہ اتار تو لو

آپ کی منظومات "غنچۂ ناشگفتہ" اور گلاب کا پھول دیکھکر" سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے زحمتِ مطالعہ دوں گا اور بس، حقیقت یہ ہے کہ آپ نے فارسی زبان کے تشبیہ نگار شاعر صائب کی یاد کو از سرِ نو تازہ فرما دیا ہے

اے نیم وا "شگفتہ" غنچہ ترے نثار ہا ۔۔۔ کس گل طراز نے تجھے بخشی ہے یہ بہار؟

یا آنکھ کھل گئی ہے تری خواب ناز سے ۔۔۔ یا سیپ ملتجی کسی قطرہ نواز سے؟

بارش ہے حسن کی ترے بدت و کشود پر ۔۔۔ یا صبح ہنس رہی ہے کلی کے جمود پر!

سربستہ اک کلی ہے جو تیرے آس پاس ۔۔۔ منہ بند اس لئے ہے کہ اس منہ میں ہے مٹھاس

یہ راز کھلتے ہی اکلی پر بھونگی آئیں گے ۔۔۔ بھونرے کلی کلی کا یہ رس چوس جائینگے

شاعت تمام صنعتِ صانع ہیں دنگ ہیں

خود کس غضب کا ہوگا وہ جس کے یہ رنگ ہیں۔

گلاب کے پھول دیکھکر شاعر کے لطیف ترین احساسات میں جو جزر و مد کا عالم ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اے پھول تیری شیریں لبی کے نثار ہیں

یہ ہونٹ پنکھڑی ہیں، کروں انکو پیار ہیں

قدرت نے کیا ورق سے بنائے ہیں گول مول

ہیجے گلابی، او لبِ خاموش منہ سے بول

اقبالؔ، آغا شاعرؔ اور داغؔ

عابد علی عابدؔ

اس زمانے میں اقبال کے روابط نواب ذوالفقار علی خاں، مرزا جلال الدین، مولوی احمد دین، مولف "سرگذشت الفاظ"، شیخ عبدالقادر خواجہ رحیم بخش، وجاہت، جھنجھانوی، غلام قادر گرامی، خلیفہ نظام الدین جالب دہلوی، آغا شاعرؔ قزلباش، غلام بھیک نیرنگ، خان احمد حسین خاں، اور محمد دین فوقؔ سے استوار ہوئے۔ اور یہ بھی مسلم ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے باقاعدہ داغؔ کی شاگردی اختیار کی۔

انیسویں صدی کے آخر میں مشاعروں کا جو رنگ تھا اور شعر گوئی کا جو اسلوب تھا اس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شعراء پنجاب کے ہوں یا بیرونِ پنجاب کے عروض اور متعلقہ علوم سے آگاہ ہونا ضروری تصور کرتے تھے۔ لفظی صنعت گری کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات یہ انداز شعبدہ گری بن جاتا تھا، اور پڑھنے والے کے ہاتھ کچھ نہ آتا تھا، اقبالؔ کے ابتدائی کلام کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ اس کے دوست اور معاصرین کسی قسم کی غزل کہتے تھے۔

آغا شاعرؔ۔ داغؔ کے شاگرد تھے۔ بلکہ ان کی جانشینی کا دعویٰ کرتے تھے، ان کا کلام داغؔ کے کلام سے مشابہ ہے، لیکن معاملہ بندی اور وقوع

گوئی کے متعلق نوعیت کے ہیں کہ ان میں اکثر چیزوں کا مشترک ہونا لازمی ہے پھر یہ بھی ہے کہ داغ اور آغا شاعر دونوں اکثر اس خاص تیور اور بانکپن کو ملحوظ رکھتے تھے جو دقوع گوئی کو لازم ہے، یہ بانکپن، تیکھاپن، یا شوخی جو دونوں میں مشترک ہے، بیشک بعض پڑھنے والوں کو اس وہم میں مبتلا کرسکتی ہے۔ کہ آغا شاعر نے بہت سے مطالب داغ سے مستعار لئے ہیں۔ لیکن جہاں مطالب، داغ اور آغا شاعر میں مشترک ہیں، وہاں اسلوب، فکرونظر کا وہ تغیر اور اختلاف موجود ہے، جو اچھے شاعر کی انفرادیت اور شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔

لاہور کی محفلوں میں آغا شاعر کا یہ مطلع بہت مشہور تھا۔

جب مرے ہونٹوں سے لعلِ شکریں جھوٹے ہوئے
لفظ جو دشنام کے نکلے، وہ سب لوٹے ہوئے

مجھے اُن کے یہ دو شعر یاد ہیں جو "تیر و نشتر" میں شائع ہوئے تھے

ہائے رے مستیاں جوانی کی — سادہ پانی، شراب ہے بالکل
اک ستمگر پہ ہم بھی مرتے ہیں — آپ کا سا شباب ہے بالکل

(منقول از شعرِ اقبال)

پہلودار شخصیت

ڈاکٹر عبادت بریلوی

آغا شاعر قزلباش مرحوم کو میں نے پہلی اور آخری بار ۱۹۳۶ء میں دیکھا، وہ بڑی نمائش کے مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ میں اس زمانے میں بہت چھوٹا تھا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ بڑے بڑے اشتہار چھپے تھے اور شہر میں جگہ جگہ چسپاں کیے گئے تھے، ان اشتہاروں میں اس وقت کے تمام بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ آغا شاعر قزلباش مرحوم کا نام بھی تھا۔

مجھے اس زمانہ میں مشاعروں میں شریک ہونے، بڑے بڑے شاعروں کو دیکھنے، ان سے ملنے، اور ان کے کلام کو انھیں کی زبانی سننے کی ایک دھن سی تھی۔

اس زمانہ کے تقریباً تمام مشہور شاعروں کو مختلف مشاعروں میں دیکھ اور سن چکا تھا۔ صرف آغا شاعر کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے مجھے یہ خبر سن کر اور بھی خوشی ہوئی۔ کہ وہ بڑی نمائش کے مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں۔

یہ مشاعرہ غالباً مارچ کے مہینے میں ہوا تھا، لکھنؤ میں بہار آئی ہوئی تھی، موسم نہایت خوشگوار تھا، میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مشاعرے

میں پہونچا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شاعر موجود تھے، دیکھکر بے حد مسرت ہوئی، مشاعرہ شروع ہوا، مختلف شاعر اپنا اپنا کلام سناتے رہے، آغا شاعر قزلباش نے بھی اپنا تازہ کلام سنایا، ایسے دلکش انداز میں ترشے ہوئے شعر پڑھے کہ محفل پر چھا گئے، سماں بندھ گیا، ایسی داد ملی کہ بقول شخصے، مشاعرے کی چھتیں اُڑ گئیں،

میں اس منظر کو کبھی بھول نہیں سکتا، آج بھی تقریباً ۲۸۔ ۳۰ برس گزر جانے کے بعد وہ منظر اسی طرح میری آنکھوں کے سامنے ہے، جیسے کل ہی کی بات ہے۔ لیکن وہ اس کے بعد صرف چار سال زندہ رہے، مارچ ۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا، ایک دفعہ اُن کو دیکھنے اور اُن کی زبانی اُن کے اشعار سننے کے بعد بار بار اُن کے کلام کو سننے کی جو آرزو دل میں بیدار ہوئی تھی وہ دل کی دل ہی میں رہ گئی، اس وقت تک مجھے نہ تو آغا شاعر مرحوم کی شخصیت سے پوری طرح واقفیت تھی۔ اور نہ میں نے اُن کے کلام کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، اس کا موقع مجھے اس وقت ملا جب میں ۱۹۴۴ء میں اردو کے اُستاد کی حیثیت سے اینگلو عربک کالج دہلی پہنچا۔ دلّی کے دوران قیام میں مجھے اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ دلّی والوں کے دلوں میں اُن کی کتنی عزت تھی، جس سے بھی اُن کے بارے میں گفتگو ہوئی، اُس نے انہیں ایک اعلیٰ درجہ کا انسان، ایک بلند مرتبہ شاعر، ایک منفرد انشاء پرداز اور دلّی کا تہذیبی روایت کا آئینہ ثابت کیا اسی زمانہ میں اُن کے صاحب زادوں آغا سرخوش قزلباش اور آغا آفتاب قزلباش سے میری ملاقات ہوئی اُن کے توسط سے

مجھے آغا شاعر مرحوم کی شخصیت ، شاعری اور انشا پردازی سے آشنا ہونے کے بے شمار مواقع ملے ، اور میں نے اُن کے بارے میں جو کچھ سُنا اس لیے میرے دل میں ان کی شخصیت کا احترام بڑھا یا اور میں نے اُن کے کلام کا غور سے مطالعہ شروع کیا۔ اور جیسے جیسے میں اس راہ پر آگے بڑھتا گیا ، میرے دل پر اُن کی بڑائی کے نقوش ثبت ہوتے گئے ۔ آغا شاعر قزلباش مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ اُنکی شاعری ہے ، وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اور اُنھوں نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ، غزل اور نظم دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل تھی ، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غزل کی صنف سے وہ ایک ذہنی مطابقت رکھتے تھے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی نشو ونما غزل ہی کی روائیت کے زیرِ سایہ ہوئی تھی ۔ اور اس روایت کے اثرات اُن کے مزاج میں کچھ اس طرح رس بس گئے تھے۔ کہ ان دونوں میں ایک مخصوص ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی ،

جس زمانے میں آغا شاعر کے ادبی شعور نے آنکھ کھولی ، اس وقت ہماری زندگی اور ادب میں دو دھارے خاص طور پر نمایاں تھے ایک تو پہلے قدیم ادب کی پاسداری اور دوسرے نئے حالات کے نتیجے میں نئے تجربات کی اہمیت کا احساس ، یہ دونوں دھارے اُس وقت ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے ، لیکن ان میں انقلاب کی سی پُر شور کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی ، ایک طرف داغ کا طوطی بول رہا تھا ، اور وہ تمام ہندوستان میں اردو کے سب سے بڑے شاعر تصور کئے جاتے تھے ، دوسری طرف

حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ اور چکبستؔ کی نئی نظموں نے ایک دھوم مچا دی تھی۔
یہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہے اور اس زمانے میں جو بھی با شعور شاعر شاعری کی دنیا میں قدم رکھتا تھا، اُس کے لئے اِن دونوں رجحانات سے اثر قبول کرنا لازمی تھا، کم و بیش اسی زمانے میں مخزنؔ کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک سے نئے رجحانات کے دھارے کو بڑی تقویت پہونچی۔ اور اس زمانے کے تقریباً تمام با شعور لکھنے والے اس تحریک سے اثر قبول کرنے کے لئے مجبور رہوئے، وہ لوگ بھی اس اثر سے دامن نہ بچا سکے۔ جو روایت کے پرستار تھے، اور قدیم رنگ کی شاعری کا مخصوص آہنگ جن کے مزاج میں رچا ہوا تھا۔

آغا شاعرؔ اس کی ایک بہت اچھی مثال ہیں، اُنھوں نے جب شاعری شروع کی تو داغؔ کے شاگرد ہوئے، اور بلا شبہ داغؔ کی قائم کی ہوئی روایت کے اثرات اُن کی غزلوں میں بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔ لیکن اِن اثرات کے دوش بدوش اُن کے یہاں بعض ایسے نئے پہلو بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ جن کو نئی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات اور انکی وجہ سے پیدا ہونے والے ایک نئے احساس و شعور نے پیدا کیا ہے

اُن کی غزلوں میں روایت اپنی رچی ہوئی صورت میں ملتی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس روایت میں داغؔ کے اثرات نمایاں ہیں، لیکن انھوں نے داغؔ کی اس روایت کے ساتھ جرأتؔ اور مومنؔ کی قائم کی ہوئی روایت کو کچھ اس طرح سے شیر و شکر کیا ہے کہ اُن کی غزلوں میں اُن کے مختلف

رنگوں سے ایک قوس و قزح کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے

آغا شاعرؔ نے اپنی غزلوں میں حسن کا بیان بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ عشق کے مختلف منزلوں کی تفصیل و جزئیات بڑے دلکش انداز میں پیش کی ہے اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ انھوں نے غزل کے ان دونوں بنیادی موضوعات کو انسانی زندگی کے بنیادی حقائق بنا کر پیش کیا ہے اس لئے اُن کے معمولی خیالات میں بھی زیادہ گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے اور وہ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل معلوم ہوتے ہیں، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا بیان اُنھوں اپنی تہذیبی روایت کے پس منظر میں کیا ہے، اس لئے اُن کے خدوخال نہ صرف نمایاں نظر آتے ہیں۔ بلکہ اُن میں نسبتاً زیادہ دلکشی کا احساس ہوتا ہے ایک مخصوص معاشرتی فضا اور مخصوص تہذیبی ماحول کے اثرات اُن کی غزل میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اُن کی میٹھی اور رسیلی زبان نے بھی اُن اثرات کو نمایاں کرنے میں بڑا کام کیا ہے، آغا شاعرؔ کی غزلوں کی غالباً سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو زبان ان میں استعمال ہوئی ہے۔ وہ صرف زبان ہی نہیں ہے ایک رچی ہوئی تہذیبی روایت کا عکس ہے! اور اُن کی غزلوں کی یہی۔۔ خصوصیت اُنھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی، یہ اشعار اُنھیں خصوصیات کے ترجمان اور عکاس ہیں۔ ع

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی۔

مجھے یاد ہے، میں نہ بھولوں گا شاعر
وہ ہنس ہنس کے منہ پھیر لینا کسی کا

انھیں یہ ضد، کہ پلک پر سے گر پڑیں آنسو
مجھے یہ دھیان، کہ محنت ہے، رائیگاں کیوں ہو

تم کہاں، وصل کہاں، وصل کی امید کہاں
دل کے بہلانے کو اک بات بنا رکھی ہے۔

ہے تیری ہی سی شکل، مگر شوخیاں نہیں
چپ چپ جب ہی تو ہے تری تصویر کیا کرے

نزر بھر ہوئے جاتے ہیں۔ اُلٹے، وہ صدا سُن کر
نالوں میں خُدا جانے یہ بے اثری کیوں ہے۔

انکارِ گریہ پر بیرے۔ کس ناز سے کہا
آنسو نہیں تو پوچھتے ہو، آستیں سے کیا؟

یہی دِن ہیں، دُعا لیلو، کسی کے قلبِ مضطر سے
جوانی آ نہیں سکتی مری جاں پھر نئے سر سے

میں نے تنہا پا کے جب اس سے کیا اظہارِ حال
پہلے تو سُنتا رہا، پھر مُسکرا کر رہ گیا

ذرا نیچے اُتر کر بات سُن لو۔ یہ یہ کیا، تم آسماں پر، ہیں زمیں پر

اک دِن برس پڑو گے ہمیں پر یہ کھُل گیا
کب تک بھرو گے روز مری جاں بھرے ہوئے

کسی کے روکنے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے؟
بہار آئی۔ چلا میں۔ یہ دھری ہیں بیڑیاں میری

اے شمع ہم سے سوزِ محبت کے ضبط سیکھ
کمبخت۔ ایک رات میں ساری پگھل گئی۔

مجھ کو آتا ہے تیمم نہ وضو آتا ہے!
سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

منّتیں کرتی ہے چتون کے مناؤں تجھ کو
جب مرے سامنے روٹھا ہوا تو آتا ہے

اور ان اشعار پر کیا منحصر ہے، آغا شاعر کے کلام میں تو ہر جگہ یہی خصوصیات نظر آتی ہیں، اور یہی سبب ہے کہ اُن کی غزلوں کے اشعار روح کی گہرائیوں میں اُترنے کی تمام صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

آغا شاعر کی شخصیت اور شاعری دونوں میں روایت اور تجربے کا نہایت ہی حسین امتزاج موجود ہے، خود اُن کی غزلوں میں جن میں روایت کا رنگ پوری طرح رچا ہوا نظر آتا ہے جگہ جگہ تجربہ کی بعض بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں خارجیت کے زیرِ سایہ مناظرِ قدرت کا جو بیان نظر آتا ہے۔ یا حسن وعشق کے علاوہ زندگی کے بعض دوسرے مسائل کی ترجمانی کی جو جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اُن

میں تجربے کا یہ پہلو بھی بہر صورت نمایاں ہے، اور یہ بھی شاعر کا بڑا کارنامہ ہے، اس تجربے نے اُن کی غزلوں کو بعض نئے موضوعات کے ساتھ ایک نیا آہنگ بھی دیا ہے۔ اور مجموعی طور پر اُن میں ایک نئی فضا بھی پیدا کی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تجربہ صرف "تنگنائے غزل" تک محدود نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے آغا شاعر کو نظموں کی طرف بھی متوجہ کیا، اور انھوں نے مختلف موضوعات پر خاصی تعداد میں ایسی نظمیں لکھیں، جن میں جدید شاعری کی اس تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔ جو آغا شاعر کے زمانے میں اپنے شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ ان نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر خود اس تحریک سے متاثر تھے، اور یہ نظمیں انھوں نے اسی تحریک کے زیرِ اثر لکھی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان نظموں میں اُن کے تجربات و احساسات کا لہو نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے، آغا شاعر کی نظمیں اُن کے مشاہدات اور احساسات کی صحیح ترجمان اور عکاس ہیں! موضوعات کے اعتبار سے ان نظموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اور ان میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ مناظرِ قدرت، تاریخی واقعات، معاشرتی معاملات۔ تہذیبی روایات، ان تمام موضوعات پر آغا شاعر نے نظمیں لکھی ہیں، اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف بیانیہ نظمیں ہی نہیں ہیں، ان میں سے ہر نظم اپنی جگہ ایک تجربہ ہے، اور اس تجربہ کو آغا شاعر نے بڑے ہی شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کی نظموں کے یہ چند اقتباسات شاعرانہ اعتبار سے دل موہ لینے کی

کس درجہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

کالی گھٹائیں اُٹھیں، وہ برسا ابرِ رحمت
ہر شاخ میں شگوفہ، کونپل ہری بھری ہے
سبزہ لہک چلا ہے، کوئل کی کوک سُن کر
قمری کا ہر ترنّم، پُر لطف بانسری ہے
چھم چھم برس رہا ہے شملے میں آج پانی
کشمیر گل فشاں ہے، گل بیز بھر مری ہے
دیکھو سُنہری کرنیں، اور برف کے نظارے
کس حسن پر ہمالہ، قدرت کا سنتری ہے
مہکے ہوئے خیاباں، نکہت سے یاسمن کی
نرگس کی آنکھ میں بھی شوخی نئی بھری ہے
سُورج کے غوطے کھانا وہ قبلہ رُخ شفق میں
دامن میں آسماں کے یہ پھلجھڑی چھٹی ہے

ابر ساتی کی بہار

متھرا جی، گردوارے آ — شام کی نگری میں رم جا
برکھا رُت میں گوکل دیکھ — بندرابن کے جنگل دیکھ
یہ وہ دھرتی ہے داتا — جس پہ آئے ہیں کاہنا
ہائے وہ صورت وہ تصویر — دل پر مارے تِنّو تِنّو تیر

وہ صندل صندل سی کایا
آنکھوں نے سُکھ، درشن پایا
ہاتھ میں مُرلی، دل میں چین
مگن مگن، رہنا، دن، رین
(کرشن کہانی)

جان بھی کیا عزیز ہوتی ہے
سب سے بڑھ کر یہ چیز ہوتی ہے
اس کے جانے کا جب خیال آیا
دَم فنا ہو گیا خدا کی قسم
قید ہو، مفلسی ہو، یا دُکھ ہو
کچھ بھی ہو یار، زندگی تو ہے
تن میں جو کچھ ہے جان ہے پیارے
جان ہی سے جہان ہے پیارے
(جانِ عزیز)

پھرتے ہیں سب کال کے مارے
محنت کرتے کرتے ہارے
شام کو سُلگے ہیں انگارے
پیٹ میں بھرتے ہیں دُکھیارے
ایشیا، ایشیا، راج دُلارے
جاگ اُٹھ، جاگ اُٹھ جاگ اُٹھ پیارے
گیہوں کا تو نام سُہانے
چاول تک جو سپنا آئے
اس نگری کو، کون بسائے
پرجا بھوکی جب مرجائے
ایشیا، ایشیا، راج دلارے
جاگ اُٹھ، جاگ اُٹھ جاگ اُٹھ پیارے
قطرے کو جاپان بنایا
پر شیا والوں کو چونکایا
چین کو تو نے خوف دلایا
اب تو بدل اپنی بھی کایا

ایشیا ایشیا، راج دُلارے

جاگ اُٹھ، جاگ اُٹھ جاگ اُٹھ پیارے (ایشیا)

وہ صبح، دمِ صبح کی وہ نور فشانی

شاداب چمن زار میں نتھرا ہوا پانی

وہ سبزۂ خوابیدہ ہیں رہ رہ کے روانی

دیکھا ہے کہیں پرچۂ الماس کو دھانی

سو رنگ سے مضمون سنورنے لگے دیکھو

عکسِ گلِ خورشید اُترنے لگے دیکھو

وہ دستِ سبک موج کا تھم تھم کے لگانا

پھیلے ہوئے دامن کا سمٹتے ہوئے آنا

پھولوں کا اُبھرنا، کبھی غنچوں کا لجانا

لالے نے دبایا ہے تہِ آب، خزانا

اب اُن کے کرشموں پہ نظر غیر کریں گے

مُنہ دھو کے حسینانِ چمن سیر کریں گے

ہیں سرخ، کہیں زرد، کہیں پھول ہیں آبی

تصویر سے تصویر نکلتی ہے جوابی

ڈھلتی ہے، سرِ بزم، گلابی پہ گلابی

ہیں ڈالیاں لغزش میں، کہ بدمست شرابی

دل شاد ہیں سب، گود میں غنچے ہیں پری سے

گل بازیاں ہوتی ہیں نسیمِ سحری سے

باہر سے چلے آتے ہیں سب ڈگڈگی والے
گھر میں کوئی ایسا نہیں جو اُف بھی نکالے
آزادی کا ہے نام مگر بند گراں ہیں
آزادیاں قسمت میں غریبوں کے کہاں ہیں
اس خاک پہ دیوار اٹھانے نہیں پاتے
ہم گھر میں کبھی گھر اپنا بنانے نہیں پاتے
ہر سال اتر جاتا ہے بوجھ اپنے سروں کا
کُل تیس کروڑ ہوتا ہے محصول گھروں کا
بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں فوجوں کے رسالے
اس بار کو اللہ ہی سنبھالے تو سنبھالے
ہم اپنی زمینوں سے کبھی سیر ہو نہیں سکتے
ہم اپنے لئے تخم خورش بو نہیں سکتے
ہم ریلی برادر کے ہیں ممنون کچھ ایسے
آذوقہ وہ دیدیتے ہیں لے لیتے ہیں پیسے
غلّہ وہاں، من بھر نہ چڑھے لاکھ سبیل میں
جاتا ہو جہاں ستّر ہزار ایک ٹرپ میں
چوبیس[۲۴] تھی سن بیاسی[۱۸۸۲] میں اموات کی تعداد
اور بانوے[۱۸۹۲] میں ہو گئی چونتیس[۳۴] تک ایزاد
سچ کہتے ہیں، شاعر کہ طرفدار نہیں ہیں پھر بھی ہیں دشمن ہیں نہ وفادار نہیں ہے

(ہندوستانی فقیر کی صدا)

آغا شاعر کے ہاں شاعرانہ انداز بیان کی تشکیل، مشاہدے کی قوت احساس کی شدّت، جذبے کی جدّت، اور تخیل کی رفعت کے ہاتھوں ہوتی ہے - اور اس میں شبہ نہیں کہ اُن کی نظموں میں ان سب کا ایک ہی حسین اور متوازی امتزاج پایا جاتا ہے -

نظم کے ساتھ آغا شاعر قزلباش اپنی ادبی زندگی میں نثر کی طرف بھی متوجّہ ہوئے - اُنہوں نے افسانے، مضامین، انشایئے، ناول اور ڈرامے بھی خاصی تعداد میں لکھے ہیں - ان سب میں ان کی دلآویز شخصیت ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے - اور اُن کو پڑھ کر اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آغا شاعر صرف شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک اعلیٰ درجے کے انشاپرداز بھی تھے -

لندن ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء

آغا شاعر کا تصور

قاری عباس حسین دہلوی

آغا شاعر شاعر تھے، نثر نگار تھے۔ ڈراماٹسٹ تھے، مترجم تھے۔ ادیب تھے، بذلہ سنج تھے، ان کی یہ خصوصیات اس قدر نمایاں ہیں کہ میں اُن کے متعلق کچھ نہیں لکھنا، لکھنے والے یہ سب کچھ لکھیں گے، لیکن شاعر مرحوم کی جن خصوصیات نے مجھے متاثر کیا وہ اُن کی انسانیت اور دردمندی تھی، جب میرا بچپن تھا اُس وقت آغا صاحب کا شباب تھا۔ وہ میرے والدِ ماجد قاری سرفراز حسین مرحوم کے دوست تھے، اس وقت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ایک گورا چٹا، خوش رو خوش پوش نوجوان دل میں اُمنگیں، خون میں جوش، آواز میں کڑک۔ جذبات میں تلاطم اشعار میں زور، پڑھنے میں شوکت اور وقار، ذرا سی بات مزاج کے خلاف ہوئی تو قیامت برپا۔ اگر بگڑ جاتے تو سنبھالنا مشکل، اگر روٹھ جاتے تو منانا دشوار، لیکن یہ سب رنگ، ایک ہلکی سی کوشش سے اُتر جاتا تھا۔ جو لوگ آغا صاحب اور اس زمانے کے آغا صاحب کو جانتے تھے۔ وہ اُنہیں منانا بھی جانتے تھے، آغا صاحب کو غرہ تھا، اور بجا طور پر غرہ تھا، شعر کہتے تھے۔ اور زور کا کہتے تھے۔ دلّی کی زبان پر کوئی ناک بھوں چڑھاتا تو آغا صاحب آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ دلّی کی زبان گیا، دلّی کی خاک کے

ایک ایک ذرّے سے عشق تھا، دلّی کی سُبکی کسی صورت میں ہو اور کسی طرف سے ہو، اُسے وہ بخشنے والے نہ تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت آغا شاعر نے اپنی ایک اسی عادت کی بدولت کیا کیا نقصان اُٹھائے، دلّی مِٹ چکی تھی دلّی والے تباہ ہو چکے تھے، لیکن آغا صاحب کے سامنے کس کی مجال تھی جو یہ کہہ دے کہ دُنیا میں کوئی جگہ دلّی سے اُونچی ہے۔

میرا تعلیم کا زمانہ تھا، میں نے آغا صاحب کی زبان سے ان کا کلام سُنا ہے اور بہت سُنا ہے۔ دو چار مشاعروں میں بھی گیا ہوں، وہ سماں آنکھوں کے سامنے ہے، لیکن مجھے اقرار ہے کہ میں اس سماں کو بیان نہیں کر سکتا۔

آغا صاحب کا شاعری میں کیا مرتبہ تھا۔ سوسائٹی میں انکی کیا وقعت تھی۔ اہلِ علم اور اہلِ دول سے اُن کے کیا تعلقات تھے، یہ اس وقت میرے مضمون سے خارج چیزیں ہیں، میں نے وہ بھی زمانہ دیکھا ہے کہ آغا صاحب کے لئے اہلِ دول آنکھیں بچھا رہے ہیں، اُن کی نازک مزاجی کا احساس ہے۔ اس لئے بڑی احتیاط سے بات کر رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اچھے اچھوں پر آغا صاحب برس رہے ہیں۔ اور وہ دم بخود ہیں، بہرحال یہ آغا صاحب کی جوانی تھی۔ جوں جوں بڑھاپا آتا گیا آغا صاحب کی شاعری میں تو کمال بڑھتا گیا، لیکن وہ سب خصوصیات جن کو جوانی نے دو آتشہ کر دیا تھا گھٹتی گئیں۔

رفتار، گفتار، طرزِ بیان، غرض ہر چیز میں تغیر ہوا نہ ہوا تو صرف اس چیز میں کہ دلّی سب کی سرتاج ہے۔ اور سب باتیں آغا صاحب برداشت

کہہ سکتے تھے اور کرتے تھے۔ لیکن دلی کی سُبکی اُن کے لئے اب بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ بڈھے شیر کو جب کبھی مشتعل کرنا چاہو دلی اور دلی والوں کو بُرا کہدو۔ پھر جو کچھ دیکھو گے اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جن لوگوں نے اس رنگ میں حضرت افسرالشعراء کو دیکھا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ دلی کا یہ فدائی دلی کیلئے کیا جذبات رکھتا تھا۔ بڑھاپے کی ابتدا میں حضرت آغا شاعر کا یہ رنگ تھا، بڑھاپا بڑھتا گیا تو ادب کا رنگ ماند اور مذہب کا رنگ نکھرتا گیا۔ اس دور میں آپ نے اپنی نجات کا سہارا اس میں ڈھونڈا کہ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ مکمل کیا۔ میں نے اس ترجمے کو پڑھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ صحیح منظوم ترجمہ ناممکن ہے۔ لیکن اسے میں آغا صاحب کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا کہوں کہ وہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے جب اور جہاں اہلِ کمال کی قدردانی نہ تھی۔ اس لئے آغا شاعر کا یہ شاندار کارنامہ طبع نہ ہو سکا۔ اور آغا صاحب یہ حسرت لیکر قبر میں چلے گئے۔

میں شاعر تو کبھی بھی نہ تھا، لیکن حضرت آغا صاحب کا یہ خیال تھا کہ میں شعر سمجھ لیتا ہوں۔ اس لئے جب کبھی کبھی ملاقات ہوتی اور موقع محل بھی ہوتا تو آغا صاحب دو چار شعر سُنادیا کرتے تھے۔ میں بہت احتیاط سے داد دیتا تھا۔ اس لئے کہ آغا صاحب کے بگڑے ہوئے تیور اکثر دیکھے تھے۔ اور اس احتیاط کا سبق میں نے حضرت آغا صاحب کے ایک ہم عصر بلکہ بزرگ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں سے لیا تھا۔ نواب صاحب مرحوم بھی اکثر مجھے اپنے اشعار سُنایا کرتے تھے۔ میں کچھ تو ان کی بزرگی کا ادب

کیا کرتا تھا اور کچھ اُن کے امتیازی رنگ سے واقف تھا۔ اس لیے داد کے معاملے میں حد سے زیادہ احتیاط کرتا تھا، باوجود اس کے اگر داد ان کے نزدیک ذرا بھی بے محل ہوتی تو وہ برس پڑتے تھے۔ اس لیے اُن کا شعر سُننے کے وقت ایک خوف طاری رہتا تھا۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ داد کیسی دی جائے اور کیوں کر، یہ اصول حضرت آغا صاحب کے اشعار سُنتے وقت بھی کسی حد تک مدنظر رکھنا پڑتا تھا۔

آغا صاحب کی نظم بھی میں نے سُنی ہے اور نثر بھی خوب لکھتے تھے زبان خالص ٹکسالی، شوکت الفاظی کے باوجود، سلاست اور سادگی اس کا طرۂ امتیاز۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ آغا صاحب کو ڈراما نویسی کا شوق ہوا۔ دُنیا نے اس فن میں اُن کا لوہا مانا یا نہ مانا، لیکن آغا حشر مرحوم نے ان کے ڈراموں کو نہ صرف قابلِ قدر سمجھا بلکہ ان کے ڈراموں سے استفادہ کیا، کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت آغا شاعر سے نسبت قائم کرنے اور اظہارِ عقیدت کرنے کی غرض سے محمد شاہ حشر کاشمیری مرحوم نے اپنا نام آغا حشر کشمیری رکھا۔ اور دُنیا آج اُنہیں اسی نام سے جانتی اور یاد کرتی ہے۔ آغا صاحب مرحوم کی زندگی کے مد و جزر میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اور ان سب کے باوجود میرا دل اُن کی عقیدت مندی کے جذبات سے لبریز ہے۔

آخر وہ زمانہ آگیا کہ بڑھاپے نے آغا صاحب کے سب دَم خم نکال دئے اب شان و شوکت سے رہنے والا آغا، جھوم جھوم کر شعر پڑھنے والا آغا،

ایک پژمردہ آغا رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ منظر ہے، جب وہ میرے والد ماجد حضرت قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی مرحوم و مغفور کی عیادت کو آئے۔ یہ ملاقات تھی دو درد مندوں کی دو دیرینہ دوستوں کی، ان ہم خیالوں کی جن کے دلوں میں دلّی، اس اُجڑی سرزمین کی کھوئی ہوئی عظمت و شان کی یاد ٹیس کی طرح رہ رہ کر اُٹھتی تھی۔ جن کی ملاقات ظاہر داریوں، دنیا سازیوں اور رسمی بندشوں سے بالکل پاک تھی، جن میں سادگی تھی، محبت تھی، خلوص تھا۔ وطن کا درد تھا۔ دلّی کا عشق تھا، پرانے زمانے کی مجلسوں، پُرانے زمانے کے دوستوں اور پُرانی دلّی کا تذکرہ چھڑا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں دونوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ آغا صاحب کی تو ہچکی بندھ گئی۔

ایک دن جامع مسجد مِل گئے، میرے گھر سے آرہے تھے اپنے مرحوم دوست کی تعزیت کے لئے گئے تھے۔ قاری صاحب مرحوم کا ذکر کرتے رہے، پُرانے قصّے سُناتے رہے۔ دوست کی یاد سے فارغ بھی نہ ہوتے پائے تھے کہ جامع مسجد پر نظر پڑی، شاہجہاں آباد کے اُجڑے دیار کا تذکرہ کرنے لگے۔ جامع مسجد کو دیکھتے جاتے اور روتے جاتے تھے، میں جامع مسجد سے اُن کے گھر تک ساتھ گیا۔ جگہ جگہ ٹھہرے، ہر مقام کی تاریخ بیان کرتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ ہم نے جامع مسجد سے موری دروازے تک کا سفر کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ جامع مسجد کے بعد پریڈ کا میدان تھا۔ اس کی تاریخی اہمیت پر نثر میں سوز خوانی ہوئی، لال قلعہ، جسے دلّی والے لال حویلی کہتے ہیں، یقیناً

آغا صاحب کی توجہ کا مرکز ہونا چاہیئے تھا۔

آغا صاحب تو آغا صاحب، ہر دلّی والا ' لال حویلی کو دیکھ کر اور اس کی تاریخ پر نظر کر کے چشم پُرنم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آغا صاحب، قلعے اور متوسلین قلعہ کا ذکر کرتے کرتے اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ آگے بڑھے تو چاندنی چوک سنہری مسجد، اور ان کے سلسلے کے واقعات نے آغا صاحب کو اپنی طرف متوجہ کیا، کیا بتاؤں کہ آغا صاحب کس کس کو روئے۔

چاندنی چوک میں جو نہر تھی اس کے لئے روئے، دو رویہ درختوں کے لئے جو نہر کے دونوں طرف تھے۔ آنسو بہائے۔ چاندنی چوک کی اُس گہما گہمی پر روئے جس میں اس سرے سے اُس سرے تک پُرانی شائستگی اور تہذیب دکھائی دیتی تھی۔ چاندنی چوک کی موجودہ بدلی ہوئی شکل میں بھی رونق اور گرم بازاری تھی۔ مگر آغا صاحب کے لئے اس میں کوئی جاذبیت اور کشش نہ تھی۔ اُن کی نگاہوں کے سامنے وہ پُرانا چاندنی چوک تھا جس کے بیچوں بیچ نہر کو پاٹ کر پٹڑی، اور پیٹڑی پر برجیاں بنائی گئی تھیں۔ جہاں پھلوں والے طرح طرح کے پھلوں کے ڈھیر لگائے، بھانت بھانت کی آوازیں لگاتے تھے۔ جہاں گاہک پر گاہک ٹوٹتا تھا۔ جہاں قوم و مذہب کی قیدیں نہ تھیں۔ آغا صاحب روئے اور ان سب باتوں پر روئے، آغا حشر صاحب، قاری صاحب اور احمد مسیع صاحب کے مناظروں پر اُنہیں رونا آیا۔ اور تو اور پیٹڑی پر جو فالودے والوں کی دکانیں تھیں، اور اب نہیں ہیں، اُنہوں نے بھی آغا صاحب کی آنکھوں سے چند آنسو نکلوا ہی دئے۔

نادر شاہ کے قتلِ عام کے ذکر پر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کوئی دتی والا اس وقت قتل ہوا وہ آغا صاحب کا سگا بھائی تھا۔ جب اُنہیں نادر شاہ کا قتلِ عام یاد تھا تو یہ فتنۂ ۵۷ء کیوں نہ یاد ہوتا۔ اور اس زمانے کا چاندنی چوک کا منظر جس کے تصوّر سے ہر دتی والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کا تذکرہ اُنہوں نے کیوں کر کیا ہوگا؟ اس کا ذکر کیا کروں؟ غرض یہ کہ آغا صاحب دتی کی ہر اینٹ کو روئے۔

آخری دَور میں حضرت افسر الشعراء ہم تن گریہ تھے۔ ایک دفعہ میں درِ دولت پر حاضر ہوا۔ بہت نحیف و نزار ہو چکے تھے۔ علیل اور سخت علیل تھے یہ معلوم کر کے کہ میں حاضر ہوا ہوں، وہ دروازے پر آئے، وہ خود نہیں آئے، پرانی تہذیب کا مِٹتا ہوا نقش آیا۔ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبات اُمنڈ کر آئے۔ میری اطلاع میرے کسی چھپے ہوئے ملاقاتی کارڈ کی نہ تھی، زمانہ ضرور مغربیت کی چولی بدل رہا تھا۔ مگر آغا صاحب پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ اُنہوں نے نئی تہذیب کے مطابق جواب میں خشک شکریہ کہلا کر نہیں بھیجا۔ وہ اُٹھنے کے قابل نہ تھے، کمزور تھے، بیمار تھے، ہاتھ پاؤں میں دم نہ تھا۔ بیٹھ گئے۔ بلا وہ دینے گیا تھا۔ کہنے لگے:-

"میاں عباس! اب مجھ میں کیا رہا ہے۔ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں، تم آئے تھے، میں آنکھوں سے آتا۔ تم میرے بھتیجے ہو، تمہاری بات ٹالنا میری وضع کے خلاف ہے۔ لیکن کیا کروں اور کیسے آؤں؟ تعلقات اور محبت کا تقاضا ہے کہ ضرور چلوں، سر کے بل چلوں، مگر اپنی کمزوری ناطاقتی کا رونا ہے کہ اپنوں سے

اپنوں کی محفلوں سے چھڑائے دیتی ہے، بستر ہی سے اُترنے کے بھی قابل نہیں
دو چار باتوں کے بعد پھر اصلی مضمون، دلّی اور دلّی والوں کی تباہی پر اُتر آئے
اور زار و قطار رونے لگے۔

آغا صاحب مر گئے، مجھے بھی مرنا ہے، میں نے دلّی کے بڑے بڑے
فدائی دیکھے ہیں، لیکن ایمان سے کہتا ہوں کہ ایسا پرستار دیکھا نہ سُنا۔ آغا
صاحب اُجڑی ہوئی دلّی کے پرستار تھے، میں آج عقیدت کے چند پھول اُن پر
نچھاور کرنا چاہتا ہوں۔ دُنیا ابھرتے ہوئے سُورج کی پرستش کرتی ہے۔ لیکن میں
اس ڈوبتے ہوئے سُورج کے اعزاز میں یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

آخر میں، میں سچّے دل سے کہتا ہوں کہ اگر بچے کھچے دلّی والوں میں آغا صاحب
مرحوم سے ایک ہزارواں حصہ بھی دلّی کی عقیدت پیدا ہو جائے تو دلّی اور دلّی
والوں کے دن پھر جائیں۔

حضرت افسر الشعراء کا مجھ پر حق ہے، یہ حق، فرض کی حد تک پہونچتا ہے
اور ادائے فرض بھی ان سطور کا محرک ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ فرض اچھی طرح
ادا نہ ہوا۔ لیکن میری مصروفیتیں شاید اس سے زیادہ بہتر طریقے پر ادائے فرض
میں مانع ہیں۔ اور نا اہلیت بھی۔

(منقول از رسالہ چمنستان دلّی)

مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

نادری قزلباش

مولانا عبدالرحمن دہلوی

کہتے ہیں کہ مرحوم آغا شاعر قزلباش ابھی کوئی دس ہی برس کے تھے اور اینگلو عربک اسکول کی ابتدائی جماعتوں ہی میں پڑھ رہے تھے کہ ان کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر میری نظر ان کے شعر سے پہلے ان کی نثر پر پڑی اور وہ بھی ایک اخبار میں۔

انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی کہ منشی غلام محمد مرحوم نے مسلمانوں کی ملی و سیاسی مصالح کی حمایت کی غرض سے وکیل نامی اخبار امرتسر سے جاری کیا جو مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس اخبار کے پہلے اڈیٹر مولوی انشاءاللہ تھے۔ حصولِ شہرت کے بعد جب انہوں نے وکیل کو چھوڑا اور اپنا اخبار "وطن" جاری کیا تو منشی غلام محمد مرحوم نے دوسرے اہلِ قلم کی قلم کاری سے "وکیل" کے صفحات کو سجایا، مگر ان کا نام اخبار میں نہ آنے دیا۔ جاننے والے جانتے تھے کہ پونجی منشی صاحب کی ہے۔ اور قلم کس کا کام کر رہا ہے۔ یہی سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۰۰ء میں منشی صاحب مرحوم کی نگاہِ انتخاب ہمارے آغا صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد پر پڑی، اور بیک وقت وکیل کے صفحات پر ان دونوں انشاپردازوں کی قلمی جولانیاں پبلک کے سامنے آئیں اور مجھے بھی لاہور میں ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں کے قلم طرارے بھرنا جانتے تھے۔ مولانا شوکتِ الفاظ کے ساتھ

زبان کی جزالت متانت کی طرف مائل تھے اور آغا اس میں شوخی اور بانکپن پیدا کرنے کی طرف۔ مگر منشی غلام محمد کسی کی نہ چلنے دیتے تھے۔ اور سیدھی سادی مدعا نگاری کی حد سے بہ مشکل ہی ان کو قدم نکالنے دیتے تھے، اس لئے ان دونوں حضرات کا نباہ منشی صاحب سے زیادہ نہ ہو سکا۔ دونوں نے یکے بعد دیگرے وکیل کو چھوڑا، مولانا نے علمی و سیاسی دماغ پایا تھا، اول ہی سے مستقبل الاسلام ان کا خاص موضوع تھا۔ وکیل کو چھوڑ کر آزاد نگاری شروع کی۔ اور جو کچھ کیا دنیا کے سامنے آیا اور آرہا ہے۔ آغا صاحب شاعر پیدا ہوئے تھے۔ طبیعت آزاد پائی تھی، قفس سے نکلے تو ہم نواؤں میں پہونچے اور پھر چہچہانا شروع کردیا، جو کچھ دنوں کے لئے بالکل بند تو نہیں کم ضرور ہو گیا تھا۔

آغا صاحب کو فطرت نے شاعر بنایا تھا۔ خوش قسمتی بھی وہی حصے میں آئی تھی، جو کہ اکثر شعرا کے حصے میں آتی رہی ہے۔ وہ پیدا ہوئے ایک قزلباش گھرانے میں، جو دلی میں ایک نادری قزلباش امیر کی یادگار تھا۔ جب تک چغتائیوں میں دم رہا یہ بھی ان کے دم دمول پر گرجتے اور جنگ کے میدانوں میں برستے ہے ان کی سلطنت نے دم توڑا۔ نئی بساط بچھی انگریز بروے کار آئے، تو آغا کے دادا کو بھی سرکار انگریزی کی فوج میں اپنی جگہ ڈھونڈھنی پڑی۔ پر سپہ گری نہ چھوٹی۔ باپ نے البتہ علم کو چھوڑ کر قلم اٹھایا۔ اور رڑکی سے اوسیئر بنے۔ آغا پیدا ہوئے تو گھر آسودہ حال فارغ البال تھا۔ شرفا کی اولاد کی طرح چاؤ چوچلوں میں پلے۔ جوانی سے پہلے ماں مرچکی تھی، ناوندر سے سابقہ پڑا۔ یہ شاعر و نازک مزاج اور رجہر آزاد۔ دونوں کی نہ بنی۔ اور شفیق باپ کی ایک نہ چلی،

یوں ہی شدہ شدہ آپ کو کمانے کھانے کا خیال پیدا ہوا۔ اور دلّی سے "آصف الاخبار" نام اخبار نکالا، وہ کچھ زیادہ دن نہ چلا، مگر اس کے مضامین نے آغا صاحب کا اُردو پریس سے خاطر خواہ غائبانہ تعارف کرا دیا۔ اور منشی غلام محمد مرحوم نے اُن کو اپنے ہاں بلا لیا، جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے۔

آغا صاحب نے امرتسر چھوڑا تو لاہور پہونچے۔ اور وہاں سے کلکتہ اور کلکتہ سے بمبئی، وہیں محمد شاہ حشر کاشمیری سے یارانا ہوا، اور اتنا بڑھا کہ برادرانہ تعلقات کی بنا پر ہمارے آغا شاعر نے ان کو بھی آغا حشر بنا دیا۔ اور لفظِ آغا ان کی طرح اُن کے نام کا بھی جزو لاینفک ہو گیا۔ وہ محمد شاہ نہ رہے آغا حشر کاشمیری بنگئے آغا حشر ڈراما نویس تھے۔ ان کے کہنے سُننے اور ضرورت کے تقاضے سے آغا صاحب نے بھی ڈراما نویسی شروع کی۔ یہی مشغلہ جاری تھا کہ حیدر آباد دکن کا خیال آیا۔ وہ بمبئی سے دُور ہی کتنا تھا، وہاں پہونچے تو مہاراجہ سر کشن پرشاد سے متوسل ہوئے۔ مہاراجہ نے ان کو عزّت کے پہلو میں جگہ دی اور شعر و سخن کی صحبتیں رہنے لگیں۔ جب مہاراجہ حضور نظام کی معیّت میں دربار تاجپوشی (جارج پنجم) کی شرکت کی غرض سے دلّی آنے لگے تو آغا کو اپنے ساتھ لائے۔ مگر دربار کے بعد جب مہاراجہ دکن کو چلے تو آغا صاحب اجازت لے کر بضرورت دلّی ٹھہر گئے۔ اسی زمانے سے میری اُن کی رسم و راہ ہوئی، اور برابر قائم رہی۔

آغا صاحب بزعمِ خود دلّی ٹھہرے تھے۔ گھر کے معاملات سُلجھانے اور والد کے ترکے میں سے اپنا حصّہ لینے کے لئے، مگر اس میں کچھ ایسے اُلجھاؤ

پڑے کہ پھر آغا صاحب کو دکن جانا نصیب نہ ہوا، جو منصوبے باندھے تھے، سب خاک میں مل گئے، مگر حسن اتفاق سے ان دنوں مہاراجہ بھوانی سنگھ والئی جھالا واڑ کو شعر و سخن کا شوق ہوا۔ وہ آغا صاحب کو دلّی سے جھالا واڑ لے گئے۔ اور بڑی خاطر و مدارات سے رکھا۔ شعر و سخن تو آپ کا مشغلہ تھا۔ مہاراجہ کی سرپرستی میں آپ نے آفتاب نام سے ایک رسالہ اور نکالا، ابھی یہ چمکا ہی تھا کہ مہاراجہ کو پیغامِ اجل آ پہونچا، جھالا واڑ میں حکومت کی بساط بدلی، آفتاب اسکی تاب نہ لایا، ڈوبا اور ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ آغا صاحب بھی دلّی چلے آئے۔ اور مہاراجہ کی قدر دانی کے سوگ کو ساتھ لئے جنجالوں میں پھنسے کہ پھر اُن سے نکل ہی نہ سکے۔ بار بار حیدرآباد جانے کا عزم کرتے تھے اور رہ جاتے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ایک دفعہ نہیں کئی کئی دفعہ زادِ راہ بھی بھیجا، مگر یہ نہ جا سکے، مگر واہ رے مہاراجہ، جو ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا جاری رکھا خیر پور سے بھی آغا صاحب کو کچھ سالانہ وظیفہ ملتا تھا، یہی وظائف اور کچھ دستِ غیب جو اللہ بھیج دیتا تھا آخری زمانہ میں ان کا ذریعہ معاش تھے۔ اور بس۔

شاعری میں جناب داغ کے شاگرد تھے۔ حاضر و غائب مشورۂ سخن کیا تھا، اُن کے مرنے پر جہاں اور حضرات جانشینِ داغ کہلائے آغا صاحب کو بھی ایک جماعت نے جانشین داغ مانا۔ اور ہمیشہ عقیدت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا۔ آغا صاحب کے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ اور استاد شاگرد دونوں ایکدوسرے سے محبت کرتے تھے ہمنے خود دیکھا کہ ایک شاگرد برق دہلوی مرے تو آغا صاحب انکو اس طرح روئے تھے جیسے کوئی باپ بیٹے کو۔ آغا صاحب

نے بھی رونے کو تو بہت سے شاگرد چھوڑے لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کوئی اپنا واقعی جانشین نہیں چھوڑا۔

تعلیم آغا صاحب کی باقاعدہ پوری نہیں ہوئی تھی، مگر اس کمی کو آپ نے کچھ اس طرح پورا کر لیا تھا کہ کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں لگتا تھا۔ جن دنوں آغا صاحب کلکتے میں تھے اور نصیر الممالک مرزا شجاعت علی خاں قونصل جنرل ایران سے صحبتیں رہتی تھیں۔ آپ نے کجکلاہ ایران مظفر الدین شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ فارسی میں لکھ کر ایران بھیجا (اس کے جستہ جستہ شعر آغا صاحب نے مجھے بھی سنائے تھے) کہتے ہیں کہ شاہ نے خوش ہو کر اس قصیدہ پر اُن کو افسر الشعرا کا خطاب عطا فرمایا۔ اسی لیے وہ افسر الشعراء کہلاتے تھے، اگر یہ سچ ہے تو یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، انگریزی فارسی سے بھی آغا صاحب نے بہت سی چیزوں کا نظم سے نظم میں ترجمہ کیا اور پسند عام ہوا۔

آغا صاحب نے لڑکپن سے شاعری شروع کر دی تھی، اس لئے کلام بہت ہونا چاہیے۔ مگر دیوان یا کلیات کا کبھی ذکر نہیں کیا، جو جو کلام میں نے اُن کی زبان سے سُنا، اُس کی بناء پر میرا یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ آغا صاحب کی شاعری میں فکر و تخیّل سے زیادہ لطافتِ زبان کا عنصر ہے۔

شعر وہ ہر صنف اور ہر رنگ میں کہتے رہے، ڈراما، اخلاق اور سیاست کے میدان میں بھی وہ موجود ہیں، مرثیہ بھی اُن کا اچھا خاصا ہے، مگر خاص چیز اُن کی غزل اور ساقی نامہ ہے۔ یا ساقی و شراب کا افسانہ۔

سارے ہم عصر شاعر اُن کا احترام کرتے تھے۔ بلکہ وہ بزرگ بھی جو اُن کے

اُستاد داغ کے ہم عصر تھے، اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، سچ یہ ہے کہ آغا شاعرانہ دل و دماغ لیکر آئے تھے، اگر زمانہ مساعد ہوتا تو وہ جس جگہ پر اب ہمیں نظر آتے ہیں، اس سے بہت بلند مرتبہ شاعر ہوتے، آخری عمر میں تائب ہو کر جو کام انہوں نے اپنی طرف سے نہایت عقیدت و نیازمندی کے ساتھ سرانجام دیا اور اپنے لیے مایۂ ناز سمجھا وہ منظوم ترجمۂ قرآن مجید ہے، مگر بہر حال وہ نظم ہے، نہ کہ شعر و شاعری۔

آغا صاحب جب جوان تھے، نکھرتا ہوا گندمی رنگ تھا، قد میانہ، چہرہ چوڑا چکلا مرزایانہ، آنکھیں رسیلی بڑی بڑی سرخ سرخ ڈورے پڑے ہوئے لمبی لمبی پلکیں، گھنی گھنی تنی ہوئی بھویں، بدن گدرا، سینہ فراخ، حوصلہ فراخ تر، جامہ زیب، خوش وضع، بذلہ گو، نکتہ رس، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے آواز بڑی پاٹ دار پائی تھی، شعر پڑھتے تو اس طرح کہ ساری مجلس پر چھا جاتے، بڑے ملنسار اور متواضع تھے، سب سے بڑی بات یہ کہ انصاف پسند تھے، آزاد و آزادہ رو تھے، اور اپنی برائیوں کا بھی اعتراف کرتے ہوئے نہ جھجکتے تھے، آخر عمر میں اکثر توبہ توبہ کرتے رہتے تھے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(منقول از چمنستان مارچ ۱۹۴۱ء)

دربارِ اعظم

سر شیخ عبدالقادر

دربار دہلی (۱۹۰۳ء) کے ملکی، تجارتی اور سیاسی نتائج تو مہینوں سے معرض بحث میں ہیں اور جہاں بعض لوگ اُن کے معترف ہیں، وہیں بعض لوگ اُن کے قائل نہیں۔ لیکن شائد دربار کے علمی نتائج پر غور کرتے ہوئے اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو علم وادب کی صنفِ قصیدہ گوئی کے مردہ قالب میں دربار نے دوبارہ جان ڈالدی ہے۔ اور اس مبارک تقریب پر ہمارے ملک کے جادو نگار سخن وروں نے اپنی اپنی طبیعتوں کے خوب جوہر دکھائے ہیں، گو ایک زمانہ قصائد پر ایسا گذرا ہے کہ تصنع، مبالغہ، اور غلو کی کثرت نے انہیں اصنافِ سخن میں نہ صرف ایک مدعائے باطل بلکہ سخن وری کے لئے ایک فنِ مہلک بنا دیا تھا۔ اور طمع زر کے سبب قصیدہ گوئی شاعروں کی آزاد منشی کا خون کر دیتی تھی۔

تاہم یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاعری کی اقسام میں قصیدہ دراصل ایک ضروری جزو ہے اور اگر اس میں مبالغے کی جائز حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تو شاعر کی طبیعت کے امتحان کے لئے شائد ہی اور کوئی ذریعہ اس سے بہتر نکل سکے۔ ہم نے خوشی سے اس بات کو دیکھا کہ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم مدظلہ، کی شان میں جو قصائد نکلے ہیں، وہ چونکہ نفع ذاتی سے نہیں لکھے گئے، اس لئے عموماً

اُن عیوب سے جو قصیدہ گوئی کو لے ڈوبے تھے خالی ہیں۔ اور بہت سی خوبیاں رکھتے ہیں، جنہیں آجکل کا مذاق ڈھونڈتا ہے۔

ایسے قصائد میں ایک ممتاز قصیدہ "دربارِ اعظم" کے نام سے ہمارے نامور دوست آغا شاعر قزلباش دہلوی ارشد تلامذہ نواب فصیح الملک۔ داغ دہلوی کی تصنیف ہے، جو نہایت اہتمام سے یوسفی پریس دہلی میں شائع ہوا ہے۔ اسمیں کوئی ڈیڑھ سو اشعار ہوں گے، اہلِ فن جانتے ہیں کہ اتنے اشعار قصیدے کے لکھنا کس قدر دشواریاں رکھتا ہے، خصوصاً جب زمین مشکل انتخاب کی گئی، جیسے حضرت آغا شاعر نے کی ہے۔ ایسی سنگلاخ زمین میں پھولنا پھلنا ہر شخص کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے لئے طبع خداداد کے ساتھ مشقِ کامل درکار ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ صرف تیس سال کی عمر کو پہونچنے تک کلامِ شاعر ایسا اُستادانہ کیونکر ہو گیا اور ابھی انتہا دیکھیں کہاں ہوتی ہے۔ زبان کی خوبیاں تو ویسے ہی اہلِ دہلی کا حصہ ہیں، مگر آغا شاعر اس بارے میں امتیازِ خاص رکھتے ہیں۔

ہم نمونتاً جستہ جستہ مقامات اس عمدہ قصیدے کے نقل کرتے ہیں۔

پہلے تشبیب ملاحظہ ہو:۔

شل رکھتے ہیں کہیں، کن فیکون کے جوہر؟
واہ کیا شانِ صناعت ہے زہے صنعت گر
کیا قیاسِ بشری، جو تری قدرت جانچے؟
مہر کے سامنے کب آنکھ کو ہے تابِ نظر؟

ایک سے ایک کی صورت نہیں ملتی حاشا
ایک سے ایک طبیعت نہیں، ہوتی خوگر
کہیں تصویرِ گلی پر ہے پری کا عالم
کہیں بازیچۂ ہر سنگ ہے مسجودِ بشر
کہیں بُلبل کا ترانہ، کہیں قمری کی صدا
کہیں بالیدگیٔ سرو، کہیں ہیں گُلِ تر
کہیں دریا ہے، کہیں ہے لبِ خشکِ ساحل
خس و خاشاک کہیں ہیں، کہیں سلکِ گوہر
حُسنِ مہتاب کہیں، تقویتِ جوششِ نمو
تابشِ مہر کہیں، جانِ ریاحین و ثمر
نغمۂ نے کہیں، دلکش کہیں آہنگِ سرود
نالہ و آہ کہیں، راحتِ قلبِ مضطر
کہیں زخمِ دلِ صد پارہ ہیں گلہائے اُمید
کہیں داغِ جگری، یاس و الم کے جوہر
کہیں سوزش، کہیں سازش، کہیں دل اور خیال
کہیں آتش، کہیں گلشن، کہیں غنچہ کہیں زر
وہ سرِ شام کہیں ایک چمن کا عالم
ہلکا ہلکا وہ دھُواں، باغ کے اُدھر اُدھر
قبلہ رُخ کی وہ شفق، زردیٔ رخسار کے ساتھ
چھپی رنگ میں ڈوبی تھی، گلابی چادر

وہ درختوں کی پھنگوں پہ ہزاروں عالم
اُن کے سائے میں وہ سبزے کی جھلک سرتاسر
وہ مناسب روشیں، اور وہ گملوں کی قطار
لہلہاتے ہوئے وہ پھول اِدھر اور اُدھر
نیچے اک قطعے میں لبریز وہ نتھرا پانی
ہلکی ہلکی سی جیسے جنبشیں تھیں رہ رہ کر
لالٹینوں کی چمک کا وہ سنہرا پرتو
بجلیاں کوندتی تھیں پانی کے اندر باہر
وہ حسینوں کے پرے، آئینۂ برقِ جمال
گون پہنے ہوئے ہر سمت بتانِ آذر
وہ ستمگار تبسم، وہ جفا گر چتون
بجلیاں اس سے گریں اُس سے رواں ہوں خنجر
فتنہ پرداز نگاہیں کہ جگر میں ٹھہریں
اتنی بے تاب ادائیں کہ نگاہیں ششدر
ایک سے ایک زیادہ تھا مٹانے کے لئے
ہر طرف خوبیٔ اُستادِ ازل کے مظہر

اس کے بعد گریز اصل مضمون کی طرف ہے جو لندن کی تاجپوشی سے شروع ہوتا ہے اور اس میں وہاں کی رسم تاجپوشی کو بہت خوبی سے بیان کیا گیا ہے، اس میں واقعیت کا رنگ تاریخی اعتبار سے قابلِ قدر ہے،

تمام وہ رسوم جو ویسٹ منسٹر ایبے میں جس میں سلاطین و مشاہیر انگلستان کے مرقد ہیں اور جہاں رسمِ تاجپوشی عیسائی مذہب کے قواعد کے مطابق ادا کی جاتی ہے۔ نہایت بسط کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ اثنائے بیان میں فرماتے ہیں۔

اتنے میں شاہ بھی پوشاک بدل کر آئے
اور اک کرسئ زرّیں پہ ہوئے زینت گر
گرد آ کے اراکین نے حلقہ باندھا
جس طرح ایک لڑی میں ہوں پروئے گوہر
رشک سے بالِ ہما ہو گیا روپوش کہیں
اک سرا پردۂ زرّیں کو جو کھینچا سر پر
آئے پھر سامنے وہ تیل لئے صدر اُسقف
شاہ کے سر پہ بہایا اُسے چمچہ بھر کر
پہلے تو شکلِ صلیب اُس سے بنائی پُوری
پھر یہ الفاظ کہے اپنی زباں سے فرفر
تیرا سر بھی یونہی ممسوح ہوا والاجاہ
جیسے ممسُوح ہوا کرتے تھے شاہانِ دگر
پھر دو زانو ہوئے شہ اور دُعائے برکت
مانگی جانے لگی اسمائے الٰہی پڑھ کر
دفعتًہ لائی گئی پہلو سے ایک تیغِ اصیل
صدر اسقف نے بہ آداب جُھکایا پھر سر

اور کی عرض کہ اے شاہ مبارک ہو تجھے
یہ وہ شمشیر ہے، جس کی ہے سیاست نوکر
پہلوئے شاہ مزیّن رہے اس سے ہر سو
خونِ دشمن سے چھلکتے رہیں دائم ساغر
باندھ اس کو تو کمر میں کہ ترا حصّہ ہے
تجھ کو بخشا ہے خداوند نے ایسا زیور
اس سے انصاف ہی کرنا کہ یہی شایاں ہے
اس سے بجھ جائیں جو بڑھتے ہوں شرارے دشر
اس سے اے شاہ کلیسہ کی حفاظت کرنا
اس سے امداد یتیموں کی ہو، بچوں کی گزر
لیجئے شاہی لبادہ، یہ انگوٹھی بھی ہے
اور دستانے بھی حاضر ہیں کرامات اثر
پہنئے شوق سے، یہ ارثِ قدیمانہ ہے
یہ عصا لیجئے، دونوں ہیں یہ، شاہی زیور
ایک پر فاختہ ہے، دوسرے پر شکلِ صلیب
دونوں یہ قوتِ بازو ہیں، زہے فتح و ظفر
ٹھہریئے، ٹھہریئے ایک اور امانت ہے حضور
یہ وہ ہے نصرت و اقبال ہیں جس کے نوکر
کہہ کے یہ، تاج اٹھایا، زہے قربان گاہ
رکھ دیا جھوم کے سرتاجِ شہاں کے سر پر

باجے بجنے لگے اک بار خوشی کے پھر تو

اڑ گئے نعرۂ بہجت، سوئے چرخِ اخضر

سرہوئیں توپیں، اُسی وقت سلامی اُتری

شور اُٹھا کہ سلامت رہیں شاہ وقیصر

اس کے بعد دربار دہلی کی طرف عنانِ توجہ پھرتی ہے۔ دلّی کو مخاطب کرکے جو اشعارِ پُر تاثیر لکھے ہیں وہ قابلِ داد ہیں لکھتے ہیں۔

واہ کیا کہنا ترا، جانِ جہاں، اِندر پت

تیری ہی خاک سے چمکے ہیں ہزاروں اختر

آسماں، تیری زمیں کو جو کہیں زیبا ہے

ذرّہ، ذرّہ ہے تری خاک کا مہرِ انور

تجھ میں وہ لعل چھپے ہیں، کہ نہ تھا جن کا نظیر

تجھ میں وہ گوہر نایاب کہ قدرت ششدر

دھرم اوتار، مہا بیر، رشی اور مُنی

وہ جواں مرد، کہ، میدان نہ چھوڑیں مرکر

وہ شہنشاہِ اولوالعزم، وہ خدام قریش

وہ شجاعانِ عرب، میرِ عجم، گردوں فر

جاں نثارِ ازلی، پشت دپناہِ اسلام

سرفروشانِ سرانداز و جلالت پیکر

وہ بہادر، کہ بگڑ جائیں تو لے لیں اقلیم

بات پر آئیں تو دم بھر میں الٹ دیں لشکر

وہ حسینانِ جہاں، جن کا نہ پر تو دیکھا
مہر گردوں کی نہ پڑتی تھیں نگاہیں جن پر
انتخاباتِ زمانہ، حکمائے کامِل
فضلائے ادب آموز و طریقت گستر
پاکبازانِ حقیقت، سخن آرائے مجاز
معدنِ علم و عمل، مخزنِ تفہیم و نظر
تو وہ ہے، جس سے ہر اک شہر نے رونق پائی
تو وہ ہے لفظ و معانی کا ہے تو ہی مصدر
تیرے ہی دَر سے تو لے آئے ہیں اُردو والے
بات کرنے کی روش، لطفِ زباں کے تیور
تو وہ ہے، تو نے لگایا ہے، چمن کو اپنے
ہند میں چار طرف ہیں تری بخشش کے ثمر[1]
برسوں آدابِ تلفّظ کو کیا ہے تعلیم
درس و تدریس سے ہر شخص ہوا بہرہ ور
پھر خدا جانے یہ کیا ہے کہ زمانہ دشمن
اُف رے احسان فراموشیٔ اربابِ ہنر
تجھ کو دلّی بھی کہیں، تو بھی ہے اُمِّ بلاد
ریشِ بابا پئے بازی ہے نہ زلفِ مادر

[1] ہندوستان میں تیس کروڑ آدمی اُردو بولتے ہیں۔

اب کے بھی دَور میں، تیرے ہی رہا سر سہرا

تاج پوشی شہِ جم جاہ کی ہے پیشِ نظر

یہ وہ عالم ہے کہ برسوں نہ کوئی بھولے گا

یہ وہ چرچے ہیں، زبانوں پہ رہیں گے اکثر

گہما گہمی ہے وہ ہر چار طرف نامِ خدا

لفظ بھی صاف سُنائی نہیں دیتے دَب کر

غرض کہاں تک نقل کریں مرصّع قصیدہ لکھا ہے۔

(از مخزن - اپریل ۱۹۰۳ء)

نثرِ شاعر

دہلی کے رسالہ چمنستان کے نوجوان مدیر آغا سرخوش قزلباش نے جو ہمارے مرحوم دوست، افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ہونہار فرزند ہیں۔ ادبِ اُردو کے شائقین پر احسان کیا ہے کہ شاعر مرحوم کے مضامین نثر کو طاقِ نسیاں میں پڑے رہنے سے بچا لیا ہے، آغا شاعر میں یہ خصوصیت تھی کہ اُن کے قلم کو نظم و نثر دونوں میں روانی حاصل تھی۔ اور اُن کی نثر سلاست کے ساتھ دہلی کی نتھری ہوئی زبان کی چاشنی لئے ہوئے تھی، اور جہاں تک تخیل کا تعلق ہے ان کی نثر میں بھی نظم کا لُطف موجود رہتا تھا۔

اس مجموعے کا نام "خارستان" رکھا گیا ہے شاید اس لئے کہ مضامین بھی بعض بعض رنگِ خار لئے ہوئے ہیں، مثال کے طور پر ایک

مضمون لے لیجئے، جس کا عنوان ہے "پوشیدہ" اس میں ایک حسینہ کا بیان ہے، جس نے اپنا نام پوشیدہ بتایا، یہ مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے :-

" یادش بخیر، یہ جوانی دیوانی کے متوالے نقوش ہیں" کہ آغا صاحب پوشیدہ کا قصہ سناتے ہوئے ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ" یہ لفظ لفظ واقعہ ہے" مگر پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے یا تو ایک چھوٹا سا افسانہ لکھا ہے، مگر اُسے اصل کر دکھایا ہے۔ یا یہ کہ اُس عجیب تنہائی کی زندگی میں جس کا نقشہ اُنہوں نے کھینچا ہے، اُن کے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک حسین تصویر "پوشیدہ" نامی پیش کر دی۔ جس نے اُن کی ایک شام کو رنگین بنا دیا۔ مگر صبح ہونے سے پہلے وہ آنکھوں سے ایسے اوجھل ہوئی، جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ اگر اس مضمون کو لکھتے ہوئے آغا صاحب متوالے دکھائی دیتے ہیں تو دوسرے مضمونوں میں اچھے خاصے بلکہ دوسروں کو جگانے والے نظر آتے ہیں۔ وہ مصلحانہ طرز کے ہیں، ایک اصلاحی مضمون کا عنوان ہے "بڑھو ورنہ کچل ڈالے جاؤ گے" اسی میں اپنے اہلِ وطن کو پُر زور الفاظ میں دعوت ترقی دعمل دی گئی ہے۔ ایک اور مضمون میں" ہندوستانی بھائیوں" یعنی ہندو، مسلمانوں، سکھوں یہودیوں، عیسائیوں سے خطاب کر کے اُنہیں آپس میں مل کر رہنے اور ایک دُوسرے کے ہوا خواہ ہونے کی رغبت دلائی ہے۔ "اپنے خالق کو پہچانو" اور "ایک قطرۂ خون کی سرگزشت" میں واعظانہ رنگ ہے، اس میں انسان کو مؤثر الفاظ میں اسکی ابتدا اور انتہا کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ "باغ بہشت" یوں تو دہرہ دون کے سبزہ و گل کی تعریف ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب

مناظر قدرت کے کتنے دلدادہ تھے اور جب اُنکی نگاہ اُن نظاروں پر پڑتی تھی تو انہیں وہ خالق یاد آجاتا تھا جس نے قدرتی نظارو نکو یہ زیبائی بخشی ہے۔ یہی مذاق "چھوٹی ہوئی" والے مضمون میں نمایاں ہے "حُسنِ اردو کا حجاب" ایک ایسا مضمون ہے جس سے زبان اُردو سے اُن کی گہری محبت کا پتہ چلتا ہے۔

ان چند عنوانوں سے جن کا ذکر کیا گیا ہے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس چھوٹے سے مجموعے میں رنگا رنگ کے مضامین ہیں، جن سے آغا شاعر کی طبیعت کی بوقلمونی ظاہر ہوتی ہے۔ آغا شاعر اُن لوگوں میں سے تھے جو اُردو کے عاشق تھے، اور جنہوں نے عمر بھر اس زبان اور اسکی ادبیات کی خدمت میں گزاری۔ اُنکی غزلوں کا ایک دیوان مطبع مخزن سے "تیر و نشتر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مگر کلامِ منظوم اس کے سوا بھی ہوگا، جو کبھی چھپنا چاہیئے۔ اپنی عمر کے آخری دور میں آغا شاعر صاحب نے قرآن شریف کا منظوم اُردو ترجمہ کیا تھا جس میں وہ سالوں مصروف رہے، تین سیپاروں کا ترجمہ شائع بھی ہوا تھا، اسکی اشاعت کی ابھی تجویزیں ہی زیرِ غور تھیں کہ آغا صاحب کو پیامِ رحلت آگیا۔

مرحوم کے بہت سے دوست اور شاگرد اس مجموعۂ نثر کی اشاعت سے خوش ہوں گے اور اسے شوق سے لیں گے اور پڑھیں گے، مگر زیادہ شوق سے ادب اُردو کے طلبا کو پڑھنا چاہیئے تاکہ وہ دیکھیں کہ قصرِ اُردو کا یہ چابکدست صناع کس بے تکلفی سے اس کے در و دیوار پر گلکاری کرتا تھا۔

(منقول از خارستان)

نومبر ۱۹۴۳ء

دلّی کا چراغ

خواجہ عبدالمجید دہلوی

جس دَور میں آغا شاعر کا انجام اور اختتام ہوا، وہ گل و بلبل کی شاعری کا آخری دَور ہے۔ اس کا آغاز میر تقی میر سے ہوتا ہے۔ اور انجام نواب مرزا داغ پر۔ کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ میر سے پہلے بھی اُردو شاعر تھے، بیشک تھے، مگر اُس وقت شاعری نے ادبیت کا پہلو اختیار نہیں کیا تھا، آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے، اس طرزِ شاعری کا سرچشمہ فارسی غزل گوئی ہے۔ ایران میں بھی خوب پامال ہوئی اور ہندوستان میں بھی۔ آخر کہاں تک، داغ پیدا ہوا اور اس پر خاتمے کی مُہر لگا گیا۔

نواب مرزا داغ اپنے زمانہ شاعری کا سرچشمہ بنے، اس سے سیراب ہونے کے لئے ملک در ملک کے لوگ آئے، غاشیۂ شاگردی دوش پر رکھا۔ مشیرینی حاضر کی، شاعر بن گئے، روز افزوں شاگردوں کی فہرست میں نام درج کرایا۔ ساون کی گھاس سے زیادہ اس کا مرتبہ نہیں ہو سکتا، مگر چند ایسے جو اس آبِ رواں سے پرورش پا کر تنا ور درخت ہو گئے، یہ تخصیص صرف چند آدمیوں کو نصیب ہوئی، جن کے نام پیش کرتا ہوں۔

آغا شاعر، نوح، جوش، قمر، سائل، بیخود، اگرچہ ان سبھوں نے شاعری میں کوئی جدت نہیں پیدا کی۔ اور اُستاد ہی کی ڈگر پر چلتے رہے،

"تاہم سُوکھے ہوئے پھُولوں سے گلدستے تیار کیے، مگر نئی طرز کے یہ گلدستے کاغذ کے پھُولوں کے ہیں، رنگ ہے بُو نہیں، کیا کریں بو کہاں سے لائیں وہ تو پہلے ہی اُڑ چکی، اب تو رنگ ہی پر گزر اوقات ہوتی ہے۔

ہمارے آغا شاعر میں تھوڑی جدّت نظر آتی ہے۔ اس زمانے کے دُوسرے شاعر نثّار نہیں ہیں۔ صرف شعر گوئی پر اکتفا کرتے ہیں۔ آغا صاحب اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کی نثر بھی ان کی نظم سے کم پایہ نہیں۔ آپ کہیں گے کہ حالیؔ کے ہاں نظم اور نثر دونوں موجود ہیں۔ جواب یہ ہے کہ وہ اس اسکول کا شاعر ہی نہیں جس اسکول کے آغا شاعر ہیں اُس میں اکثر جگہ اپنے ہم مشربوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے ہیں۔ خصوصاً زبان اور محاورہ بندی جو اس شاعری کی جان ہے، اُس کو اگر کوئی داغؔ کے بعد نبھاتا ہے تو وہ یہی مرد میدان ہے۔ اگر میری بات پر کچھ شک وشبہ ہو تو اُن کا دیوان حاضر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، چند چیدہ شعر عرض ہیں ملاحظہ ہوں:۔

جو ترے سامنے ہو آتے ہیں

دل و دیں، جان کے کھو آتے ہیں

جان کے لفظ نے شعر میں جان ڈالدی ہے۔

چار آنکھیں کبھی ہو جاتی ہیں آتے جاتے　　نظرِ لطف کہاں، چشم مروّت کیسی

معشوق کی بے التفاتی کا سماں آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے۔

اک تم ہو کہ دل چھینا ہے دزدیدہ نظر سے

اک ہم کہ ہمیں آنکھ چُرانی نہیں آتی

دُزدیدہ نظر اور آنکھ چرانے میں جو لُطف ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سُنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا

زبان اور مضمون دونوں کی ندرت قابلِ دید ہے۔

کبھی ساون کی جھڑی ہو کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے مرے اللہ کہ چھاجوں برسے

زبان کی خوشنمائی پر جان فدا ہے، اور چھاجوں برسے کا محاورہ انہیں کا حق ہے۔

جو وعدے کی شب تم نے ٹالی نہ ہوتی
مری رات اس طرح کالی نہ ہوتی

اُستاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا شعر ہے۔

آئے جاتی ہے پیاری پیاری یاد   دل سے جاتی نہیں تمہاری یاد

زبان کی خوشنمائی کی انتہا ہے۔

کہاں تک شعروں کا انتخاب کروں، ہیروں سے دیوان بھرا پڑا ہے۔ نظر بینا درکار ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ آغا صاحب داغ کے بعد دلّی کا چراغ تھے۔ مگر ہر چراغ کو صبح ہوتے گل ہونا ہے گل ہو گئے۔ اللہ تعالےٰ مغفرت کرے۔

(از رسالہ چمنستان دہلی)
مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

دلّی اسکول کا آخری مرثیہ نگار

عبدالرؤف عروج

شمالی ہند میں دہلی والوں نے مرثیہ گوئی کو عام کیا تھا۔ دہلی میں کس زمانے سے مرثیے لکھے جارہے ہیں، سنین کے ساتھ غلط ہوگا، اتنا یقینی ہے کہ عہدِ محمد شاہ میں غمگین۔ مسکین۔ حزیں۔ یک رنگ اور عاصمی جیسے مرثیہ گو دہلی میں موجود تھے۔ جن کی استادی اور فن کا اعتراف معاصر وقائع نگار درگاہ قلی خاں نے مرقع دہلی میں کیا ہے جبکہ وہ خود بھی فارسی کا زبردست مرثیہ نگار تھا۔

اس پس منظر میں یہ بات درست نہیں ہوگی کہ لکھنو کے مرثیہ نگاروں نے پہلی مرتبہ ادبی سطح پر دہلی کے مرثیہ نگاروں کو متاثر کیا اور وہ ان کے لہجہ و اسلوب کے ساتھ اپنی فکر کو ہم آہنگ کرنے لگے، جن دنوں لکھنؤ میں دلگیر فصیح، خلیق، ضمیر، انیس، دبیر اور ان کے تلامذہ کا آوازہ بلند ہو رہا تھا دہلی میں ایک دو نہیں متعدد مرثیہ گو اس صنف کے ذریعہ زبان و ادب کی تطہیر میں مصروف تھے، غدر کے قریبی زمانے میں، انتہائی ابتری اور انتشار کے باوجود دہلی کے مرثیہ نگاروں نے اس بے بضاعت صنف کو پروان چڑھایا۔ نواب حامد علی خاں، نواب حسام الدین حیدر خاں، نواب حسین مرزا ناظر کے تعمیر کردہ عزاخانوں اور امام باڑوں میں مجالسِ عزا منعقد ہوتیں، اور ان میں مختلف شعرا نو تصنیف مرثیے سناتے تھے، بعض مجالس میں بہادر شاہ ظفر

کی شرکت اور سلام خانی بھی یقینی بتائی جاتی ہے۔

غدر کے بعد جن لوگوں نے مرثیہ کو ترقی دی اور صنفی طور سے آگے بڑھایا ان کا سلسلہ آغا شاعر دہلوی پر ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں غالب کی شہرت ان کے معاصرین کی قدر و قیمت لے اڑی، وہیں خاندان انیس و دبیر کے مرثیہ گو افراد کے قبول عام نے اپنے معاصرین کے مرتبہ کو نگاہ سے اوجھل کر دیا۔ اور یہ ناشناسی کی گرد یہاں تک بڑھی کہ دہلی، رام پور، عظیم آباد اور حیدر آباد کے بعض اہم مرثیہ نگار اس کی لپیٹ میں آ گئے اور اس نے آغا شاعر دہلوی تک کو محفوظ نہیں رکھا اب صورت حال یہ ہے کہ بعض محقق اور ناقد تک ان کو داغ کے شاگرد اور ان کے مکتبۂ خیال کے ایک ترجمان سے زیادہ نہیں جانتے۔ حالانکہ ان کی مرثیہ گوئی انہیں داغ کے مکتبۂ خیال سے الگ کر کے اپنے معاصرین میں ایک امتیازی مقام دلا سکتی ہے۔

آغا شاعر دہلوی، نظم ہو یا نثر، ناول ہو یا افسانہ، تاریخ ہو یا تذکرہ ادب ہو یا مذہب، کسی بھی موضوع پر بند نہیں تھے، ان کے متعلق یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ انہوں نے جس موضوع کو چھوا کمال کی حدوں تک پہونچا دیا، نظم سے اکتائے، نثر کو پکڑا، اس سے سیر ہوئے، مذہب کی راہ لی کلام مجید کا منظوم ترجمہ کیا، مرثیے لکھے اور اس تواتر کے ساتھ لکھے کہ اس بارے میں ان کی شہرت دہلی کی حدود کو توڑ گئی اور ان کے سلام اور مرثیوں کے جستہ جستہ شعر ہندوستان میں گونجنے لگے۔ اب بھی ہندوستان کے علاوہ پنجاب اور سندھ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آغا شاعر دہلوی کی زبانی ان کے مرثیے سننے کے لئے دور دراز کا سفر طے کر کے لاہور اور خیر پور پہونچتے تھے، ایک

عینی شاہ کے بیان کے مطابق آغا شاعر دہلوی کی آمد کا علم ہوتے ہی مجلس میں لوگوں کا ہجوم بڑھ جاتا، جن لوگوں کو جگہ نہ ملتی وہ قرب جوار کی دیواروں چھتوں اور درختوں پر چڑھ جاتے، اپنی زندگی کو اس قسم کے دوسرے خطروں میں ڈال دیتے، لیکن ان کی زبانی ان کا مرثیہ ضرور سنتے۔

آغا شاعر کی مرثیہ خوانی کا انداز سب سے الگ تھا، وہ شعر کی ادائیگی کیا کرتے فضا میں ڈرامائی کیفیت مرتعش ہوتی محسوس ہونے لگتی تھی۔ آغا شاعر کے مرثیے، شستگی، روزمرہ کی صفائی، محاورہ بندی، سلاست اور روانی کے اعتبار سے لکھنؤ اسکول سے بڑی حد تک مختلف تھے۔

ان کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا کہنے والا بے جا خود ستائی اور تعلّی کا خوگر نہیں، زبان و ادب، الفاظ و معنی کا بے لوث پرستار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں عام رقّت انگیزی اور جذبات افروزی کی بجائے ایک خاص قسم کی متانت، سادگی، اور پرکاری، نظر آتی ہے، جس کا وافر علمیت اور عمیق مطالعہ کے بغیر پروان چڑھنا ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ایک مرثیے کا یہ چہرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے،

تسلیم و رضا، مسلکِ اربابِ وفا ہے　　ثابت قدمی، عاشقِ صادق کی ادا ہے
اصبر بہ قضا، منزلِ اوّل پہ لکھا ہے　　تلوار کے سائے میں یہ خط صاف کھنچا ہے

یہ راہ وہ ہے ناز کو نشو و نما اسی میں
سر نذر کیا کرتے ہیں جانباز اسی میں

بھٹکے ہیں جہاں آدمِ اوّل، وہ یہی ہے　　آنکھوں نے جہاں بھر دیے جل تھل، وہ یہی ہے

جس راہ میں بھٹے نوح بھی بیکل وہ یہی ہے   پانی پہ لگے تیرنے بادل، وہ یہی ہے

ہاں ذکریا کو ایک یہی جزو توکّل تھا
گلزارِ خلیل ایک اسی راہ کا گُل تھا

ایوب کے نسو ٹکڑے گریباں ہوئے اسمیں   آتش بہ دہن موسٰی عمراں ہوئے اسمیں
بے روح رواں عیسٰی دوراں ہوئے اسمیں   خورشیدِ لبِ بام سلیماں ہوئے اسمیں

یونس بھی کسی جا پہ محبوب گئے ہیں
یوسف بھی اسی چاہ میں تو ڈوب گئے ہیں

آغا شاعر اپنے مرثیوں میں اظہار مطالب کی ایسی تلمیحات سے کام لیتے اور ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان کے اشعار خود بخود دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں - ان کو جذبات، کیفیات اور محسوسات پیش کرنے کا بھی خوب ڈھنگ آتا ہے - وہ اپنے کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے - میں اس سلسلے میں ان کے ایک مشہور مرثیہ کی مثال دوں گا - اُنھوں نے یہ مرثیہ لشکرِ حسینی کے علم بردار حضرت عباس اور ان کی معرکہ آرائی کے تعلق سے لکھا ہے - اس میں وہ حضرت عباس کے حرم سے رخصت ہونے کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں :-

لیتا ہوا سلام وہ گردوں حشم بڑھا
ایک اک قدم ثباتِ قدم پر قدم بڑھا
رُخ کی کشش سے کھینچ کے ہر اک بیش و کم بڑھا
پیاسوں کو اپنے سائے میں لینے علم بڑھا

جان آگئی، ترائی کی حسرت نکل گئی
دم بھر سروں پہ ابر رہا، دھوپ ڈھل گئی
احباب دینی چاہتے تھے تہنیت، مگر
موقع نہ تھا کہ سب کی تھی انجام پر نظر
پھر بھی یہ کہہ اُٹھے کئی خدامِ خوش سیر
سردار یہ علم رہے تا حشر دوش پر
قاسم، پھریرا سونگھتے ہی جھومنے لگے
اکبر، چچا کے بازوؤں کو چومنے لگے
پیاروں کو پیار کرکے یہ سادات نے کہا
آقا کے جانثارو مسرت ہے اس میں کیا
اک عارضی خوشی ہے، نہیں تہنیت کی جا
اپنا امام شام کی فوجوں میں ہے گھرا
بچوں کی اس کے پیاس بجھائیں تو بات ہے
جانیں لڑا کے اس کو بچائیں تو بات ہے
پیارو یہ جنگ، معرکۂ امتحان ہے
قلت کا پریہاں کسے وہم و گمان ہے
لاکھوں پہ بھاری ایک قریشی جوان ہے
سرباز ہے جری ہے، تہور نشان ہے

جو کاہ ہے وہ کوہ کی ضربت سنبھال لے
بچہ ہمارا، شیر کی آنکھیں نکال لے
کس معرکے میں اپنے بزرگوں کا تھا نہ ساتھ
کیسے رفیق تھے وہ محبانِ خوش صفات
کیا کیا تھے دست و بازوئے حلالِ مشکلات
تلوار پہلے کھینچتے تھے اور پیچھے بات
مشکل جب آپڑی ہے سپاہی کے سامنے
سر رکھ دیئے ہیں شیرِ الٰہی کے سامنے
ہم بھی وہی، وہی اُنہی شیروں کے ہیں خلف
یہ ہاتھ وہ ہی ہاتھ ہیں، دیکھو مری طرف
یہ جسم وہ ہی جسم ہے سر باغ سر بکف
یہ خون وہ ہی خون ہے خونِ شہ نجف
پانی سبی چیز کوئی نہ دے میرے بھائی کو
ہاں تو سہی جو روند نہ ڈالوں ترائی کو
ہاں شیر وہاں، اکھاڑ لو نیزے زمین سے
مرفق دکھائی دینے لگے آستین سے
لنگر وہ استوار ہے کرسی نشین سے
مل جائیں کوہ، غم نہ ہلو قاشِ زین سے

دریا ہٹے، زمین ہٹے، آسماں ہٹے
لیکن نہ رن سے کوئی حسینی جواں ہٹے

اسی مرثیے میں ڈرامائی کیفیت اور مکالموں کا در و بست بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ زیادہ مثالیں دے کر مضمون طویل نہیں کرنا چاہتا، صرف اتنا کہوں گا کہ آغا شاعر نے مرثیوں کے علاوہ سلام بھی کہے وہ سلام اور مرثیہ دونوں پر قادر تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان دونوں اصناف میں اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی تھی۔

بُرا ہو ناشناسی کا کہ لوگوں نے آغا شاعر کی شاعری کے اس پہلو پر بالکل توجہ نہیں دی۔

قصرِ اُردو کا معمار

سید عزیز حسن بقائی

حضرت آغا شاعر مرحوم دلّی کے ایک نامور شاعر تھے، آپ خاندان قزلباش کے ایک خوش رو، خوش گلو، تندرست جوان تھے۔ بہت پُرگو تھے، بہت مشتہ اور پاکیزہ، اُستاد کی شہرت کو چار چاند لگانے والے شاگردوں میں تھے اور اس اعتبار سے قصرِ اُردو کے معمار کہے جا سکتے ہیں، آپ کے زورِ قلم کا یہ عالم تھا کہ کلامِ الٰہی کو منظوم کر دیا۔

میں بچپن کی سرحدوں کو عبور کر چکا تھا، وہ نوجوان تھے، ۱۹۱۳ء میں میری آمد و رفت حضرت مسیح الملک حکیم اجمل خاں شیدا کے ہاں ہو گئی تھی حضرت حکیم اجمل خاں کو اُردو علم و ادب کا خاص ذوق تھا، انکی رات کی صحبت میں نواب لوہارو، نواب تاباں، نواب سائل، حاجی عبدالغفار حاجی محمد یوسف بانی، حاجی عبدالرزاق جوہری، رائے بہادر سلطان سنگھ، رائے بہادر لالہ سری رام، رائے بہادر چھنّا مل وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ جس میں شعر و ادب کے چرچے ہوتے تھے، مشاعرے ہوتے تھے۔ اور علم و ادب کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور سیاسی حالات پر تبصرے۔ تقریباً رات کے بارہ بجے تک یہ صحبت رہتی تھی۔

میں شاعر تو نہ تھا مگر شعر و ادب سے بیگانہ بھی نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء سے

مضامین لکھ رہا تھا حکیم صاحب پر ابھی گہرا سیاسی رنگ نہ چڑھا تھا، مگر حکیم صاحب کی پالیسی کروٹ بدل رہی تھی، حضرت ڈاکٹر انصاری، حضرت مولانا محمد علی، حضرت مفتی کفایت اللہ کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی، مگر یارانِ میکدہ کو حکیم صاحب کی نئی سیاسی مشغولیت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

حکیم صاحب کا دیوان خانہ، حکیم صاحب کی نشست گاہ، ہندو مسلم اتحاد اور تہذیب کا گہوارہ تھے، جہاں علم مجلس آتا تھا، جہاں کے جمع ہونے والوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، جہاں انسانیت تھی، شرافت کے جوہر کھلتے تھے۔ کسی ایسے ویسے کے داخلے کی اجازت نہ تھی۔ چنے ہوئے شریف خاندان ہندو مسلمانوں کے لئے قصرِ مسیح الملک کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۴ء میں قصر مسیح الملک میں ایک خصوصی مشاعرے کا اعلان ہوا، اور روزمرہ سے کچھ زیادہ لوگ بلائے گئے انہیں حضرت آغا شاعر، اور حضرت بیخود دہلوی بھی منجملہ شعرائے کرام کے تھے۔

نواب سائل اور نواب تاباں میں شاعرانہ چشمک تھی، نواب سائل حضرت داغ کے شاگرد اور داماد تھے۔ نواب تاباں حضرت غالب کے شاگرد تھے، دونوں سگے بھائی تھے۔ نواب تاباں عمر میں بڑے تھے۔ نواب سائل ان سے چھوٹے تھے، حکیم صاحب کے دونوں ہم عمر تھے، لیکن دونوں حکیم صاحب کا احترام اپنے بزرگوں کی طرح کرتے تھے، کیا مجال ہے کہ نگاہ ملا کر بات کرتے۔

حکیم صاحب خود غالب سے متاثر تھے، مگر جان بوجھ کر نواب تاباں کے سامنے حضرت ذوق اور داغ کی تعریف کرنی شروع کر دی، نواب تاباں بہت

جز بز ہوئے، لیکن جونہی نواب سائل نے اپنے اُستاد یا دادا اُستاد کی حمایت میں کوئی لفظ کہا یہ بے آپے ہوگئے، اور سائل صاحب مرحوم کو ان کی شاعری کو سنا ڈالیں، اور سائل صاحب کو "داغی" کے خطاب سے نوازنے کے علاوہ جو کچھ کہہ سکتے تھے، کہہ ڈالا، کسی کی مجال نہ تھی کہ نواب تاباں عرف نواب "ڈھولکی" کے سامنے دم مارے، غضب کے چرب زبان تھے۔ بہت اچھا کسرتی جسم تھا، بہت اچھی شطرنج کھیلتے تھے اور بہت بڑے پتنگ باز تھے،

حضرت حکیم اجمل خاں نے آج مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے "بی جمالو" کا پارٹ ادا کیا، اور نواب تاباں نے آموختہ دہرایا، کیا مجال جو نواب سائل کی تیوری پر بل آجائے، نواب تاباں چھوٹے بھائی پر برس رہے ہیں، مگر ہائے دلی کی تہذیب، کہ اُف تک نہیں کرتے،

میں نے دیکھا کہ قصرِ مسیح الملک کے ایک کونے میں ایک بہت خوبصورت نوجوان، بہت مضبوط جسم، ان دونوں کی چشمک سے متأثر ہو رہا ہے اور آخر غیض میں آکر اس نے نواب سائل کی حمایت شروع کر دی۔

حکیم صاحب بھانپ گئے، آج تاباں کی خیر نہیں ہے، مسکرا کر فرمایا، شاعر صاحب، آپ میرے پاس بیٹھئے، ان دونوں بھائیوں کے معاملے میں دخل نہ دیجئے، دونوں آپس میں بھگت لیں گے، حضرت ذوق اور حضرت غالب کی شاعری، ہماری تعریف اور ان کی پہلوانی سے بے نیاز ہے۔

اب میں سمجھا کہ شاعر صاحب یہ ہیں، اور سائل صاحب کے حمایتی داغ اسکول کے ستون ہیں، مجھے حکیم صاحب نے اشارہ کیا اور میں نے شاعر صاحب کو ہاتھوں ہاتھ

حکیم صاحب کے برابر پہنچا دیا۔ شاعر صاحب اس عزت افزائی پر بار بار تسلیمات کرتے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں "حضرت میں اس عزت افزائی کے قابل کہاں"۔

یہ تھی میری افسر الشعراء، اُستادِ زباں حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی سے پہلی ملاقات، جس کے بعد یہ ملاقات بڑھی اور اتنی بڑھی کہ جب بھی وہ کوچۂ چیلاں تشریف لاتے تو مجھ سے ملاقات کئے بغیر نہ جاتے اور اگر میں گھر پر نہ ہوتا تو رقعہ لکھ کر رکھ جاتے، پھر میری یہ حالت تھی کہ میں اس رقعہ کی رسید خود بن جاتا، اور آغا صاحب کے مکان کشمیری گیٹ پر جاتا، میرا، اُن کا، یہ معمول زندگی کے آخری سانس تک جاری رہا۔

لکھنا بہت چاہتا تھا، لیکن وقت بہت کم ہے، اور میرا بھی آخری وقت ہے، تقریباً چالیس سال کی ایک صحبت کا مختصر تذکرہ لکھ دیا، ورنہ اب نہ دلّی رہی اور نہ ہی دلّی والے، مجھ سے مرثیہ خوان بھی چند دن کے مہمان ہیں پھر کون جانے گا کہ یہ غالب کی دلّی کیا تھی اور اب اس کو کیا بنا دیا ہے۔

(منقول از شعلہ و شبنم دلّی۔ شاعر نمبر ۱۹۵۳ء)

رباعیاتِ خیام کا سب سے بڑا مترجم

مولانا عطاء اللہ پالوی

رسالہ کلیم (دہلی) میں ہم نے ایک مضمون "رباعیات خیام" کے عنوان سے لکھا تھا، جس میں یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ مغرب کی تقریباً ہر زبان میں، ان کے جتنے تراجم ہوئے ہیں، اُتنے صرف انگریزی میں ترجمے موجود ہیں، یہ عرض کیا تھا کہ فٹز جیرلڈ جو "رباعیات خیام" کا سب سے بڑا مترجم سمجھا جاتا ہے، اس کا ترجمہ سب سے زیادہ مہمل اور ناقص ہے، ثبوت میں ہم نے اس کے اکثر ترجموں کو اصل رباعی کے دوش بدوش پیش کیا تھا، جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جرلڈ نے کسی رباعی کے اصل مفہوم اور حسن تک پہنچنے کی مطلق کوشش ہی نہیں کی، یا پھر وہ رباعی کے چند مخصوص الفاظ کے پھیر میں پڑ کر بھٹک گیا۔ اس کے بعد ہم نے اردو زبان کے ترجموں کا ذکر کیا تھا اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ "میں ببانگِ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ رباعیاتِ خیام کا سب سے بڑا، سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ مترجم، دہلی کا مایۂ ناز شاعر آغا شاعر ہے"

ہم کو مضمون لکھنے کے وقت یہ اندیشہ ہوا تھا کہ جرلڈ کے ترجمے کو ناقص کہنا، مغرب زدگان کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہوگا، کیونکہ نہ صرف انہیں اب تک یہی سمجھایا جاتا رہا ہے کہ وہ سب سے بہتر ترجمہ ہے، بلکہ اُن کے غلامانہ دماغ میں مغربیت اس درجہ رچ گئی ہے، کہ وہ مشرقیت کی افضلیت کبھی برداشت کر ہی نہیں سکتے، چنانچہ ہر چند کہ ہم نے "تمہید" میں اس کی کاٹ کر دی تھی مگر وہ

کار آمد نہ ہوئی اور میرا اندیشہ بجا نکلا۔

جناب مدن مداری لال سکسینہ نے ایک مضمون بعنوان "عمر خیام" کے ذریعے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دی، ارادہ تھا کہ ان سے دو دو باتیں ہو جائیں مگر اس کا کوئی موقع ملنے نہ پایا تھا کہ ہم خود مسلسل علالت میں مبتلا ہو گئے لیکن اب جبکہ "چمنستان" کا شاعر نمبر نکل رہا ہے، اور اس کے لئے کچھ لکھنے کی ہمیں بھی دعوت دی گئی ہے، ہم یہ چند صفحات حاضر کر رہے ہیں۔

سکسینہ صاحب نے سب سے پہلے ارشاد فرمایا ہے کہ "مضمون کا خاص مقصد جناب آغا ظفر علی قزلباش شاعر دہلوی کے رباعیاتِ خیام کے اردو ترجمے کی تعریف ہے۔ اس "ارشادِ گرامی" کا جواب دینا تین وجوہ سے مہمل ہے اول اس لئے کہ ہم نے یہ پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ مغرب زدہ دماغ ہمارے اس مضمون کی جس میں "انگریزی" پر "اردو" کو ترجیح دی گئی ہے، تاب نہ لا سکے گا۔ اور یہ اسی بے تابی کا نتیجہ ہے، پھر جواب دی ہوئی بات کا مزید جواب کیا دیا جائے۔

دوسرے اس وجہ سے کہ یہ اعتراض تو ہر علمی و ادبی بالخصوص تنقیدی مضامین پر ہو سکتا ہے، خود سکسینہ صاحب کا پورا مضمون مغربی مترجم فٹز جیرلڈ کے انگریزی ترجمے کی تعریف میں ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی ایک مشرقی کی "حمایتِ مشرق" ایک مغرب زدہ مشرقی کی "مغرب پرستی" سے بہر حال افضل ہے۔

تیسرے اس وجہ سے کہ آغا شاعر مرحوم نہ میرے رشتہ مند تھے، نہ دوست، نہ شناسا، اور نہ میری کوئی غرض ان سے وابستہ تھی، جو ان کے ترجمے

کو سب سے اچھا کہہ کر ہمیں اُن کو خوش کرنا تھا۔ سکسینہ صاحب کو شاید نہیں معلوم ہے کہ ہم نے جس مصنّف یا جس تصنیف پر بھی اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ محض بے لوث۔ ہم نے آج تک اپنے کسی دوست شاعر یا ادیب کی تحسین و تنقیص میں قلم نہیں اٹھایا ہے۔ جس کی وجہ محض یہ تھی اور ہے کہ وہ

تعریف دوستوں کی نہیں معتبر امیر ٭ اچھا ہے وہ کلام کرے جو عدو پسند

پھر اگر آغا شاعر مرحوم میرے شناسا ہوتے تو میں اُن کی تعریف میں کیسے کچھ لکھ سکتا تھا؟

سکسینہ صاحب نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ جرلڈ نے ترجمے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے، ان کا ہم پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ہم نے یہ کیوں کہا کہ "جرلڈ نے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ خیام کے خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے" چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"ایک زبان کی تصنیف کے ترجمہ دوسری زبانوں میں جو کامیاب ہوئے ہیں، وہ ترجمے اسی بڑے اصول کے ماتحت کہ مترجم کے خیال کو اپنی زبان میں ادا کرے"

ساری تصانیف کے ترجمے میں اور نظم کا نظم میں ترجمہ کرنے میں جو فرق ہے شاید سکسینہ صاحب اُس کو محسوس نہیں کرتے، وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ نظم کا نظم میں ترجمہ کرنے کے وقت اس کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ بلا تبدیلِ ہیئت اصل شاعر کا جو مفہوم ہے وہ اُن تمام و کمال خوبیوں کے ساتھ منتقل ہو جائے جو اس کے لئے مایۂ ناز ہیں، مثلاً خیام کی ایک رباعی ہے:۔

آں قصر کہ بہرام در و جام گرفت ٭ آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت

بہرام کہ گور می گرفتے ہمہ عمر ٭ بنگر کہ چگونہ گور بہرام گرفت

اس رباعی میں صرف دنیا کی بے ثباتی کا درس دیا گیا ہے اور اس کا سارا حسن لفظ "گور" میں پنہاں ہے، ظاہر ہے کہ یہ رباعی جیرلڈ کے کام کی نہ تھی، کیونکہ نہ مفہوم میں کوئی بڑا انوکھا پن ہے، نہ رباعی کا حسن اس زبان میں منتقل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی مگر اس نے اس رباعی کا بھی ترجمہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ترجمہ کیسا ہوگا، اور صرف اسی پر منحصر نہیں، ہم نے بہت سی رباعیوں کا خود مقابلہ کر کے دیکھا ہے، مگر کوئی بھی ترجمہ ایسا نہیں جو اصل رباعی کے پورے مفہوم اور سارے حسن پر حاوی ہو پھر ہم کیسے مانیں کہ وہ سب سے بڑا مترجم ہے؟ سکسینہ صاحب نے فرمایا ہے،

"جناب عطاء اللہ صاحب کا یہ خیال بھی تو غلط ہے کہ جیرلڈ کی ایک رباعی بھی ایسی نہیں ملے گی جسے خیام کی رباعی کا صحیح ترجمہ کہا جا سکے، انگلستان کے مشہور محقق ایڈورڈ ہیرن ایلن نے فٹز جیرلڈ کی رباعیوں کا خیام کی رباعیوں سے مقابلہ کر کے یہ بات طے کی ہے کہ فٹز جیرلڈ کی ۱۰۱ رباعیوں میں سے ۴۹ رباعیاں خیام کی رباعیوں کا لفظی ترجمہ ہیں"۔

... یہی تو مغرب زدگی کی وہ لعنت ہے جو ہم ہندوستانیوں پر پورے جاہ و جلال کے ساتھ سوار ہے، خود تحقیق کریں مگر نہیں، مشرقی محققین کو قابل اعتنا سمجھیں گے نہیں، صرف یورپین لٹریچر پر اس طرح بھروسہ کئے بیٹھے رہیں گے اور اس پر ایسا اعتماد رکھیں گے گویا وہ خدا ہی کا کلام تو ہے، سکسینہ صاحب آپ نے انگلستان کے ایک محقق کا قول تو سنا دیا، اب ہم سے ہندوستان کے (جو بہ نسبت انگلستان کے خیام کو سمجھنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے) ایک محقق کا قول سنئے، رباعیات خیام کے سب سے بڑے "ریسرچ اسکالر" میر ولی اللہ بہت غور و خوض اور تحقیق و تدقیق کے

بعد تحریر فرماتے ہیں کہ،

"فٹز جیرلڈ کے ترجمے کو تو عام اصطلاح میں ترجمہ کہہ ہی نہیں سکتے، فٹز جیرلڈ کی ایک انگریزی رباعی دیکھیے اور پھر رباعیاتِ عمر خیام میں وہ رباعی ڈھونڈیئے جس کا وہ ترجمہ ہے، بڑی کوشش و کاوش کے بعد کوئی قریب قریب خیال کی رباعی مل جائے تو مل جائے اور بعض صورتوں میں تو بالکل کوئی رباعی خیام کی ایسی نہ ملے گی جس کا انگریزی رباعی سے دور کا بھی تعلق ثابت ہو سکے۔"

ظاہر ہے کہ اس صورت میں سکسینہ صاحب کے لئے سوائے اس کے اب اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ جیرلڈ کی کم از کم چار پانچ رباعی ہمیں تلاش کر کے ایسی دکھائیں جو واقعی خیام کی رباعیوں کا ترجمہ ہو یا کہا جا سکے، ورنہ صرف لفظی اصرار سے تو حقیقتیں نہیں جھٹلائی جا سکتیں۔

ہمارے سکسینہ صاحب نے شاید میری واقفیت کے لئے یہ بھی فرمایا ہے

"دنیا کی تمام زبانوں میں متعدد ترجمے رباعیاتِ خیام کے ہو چکے، بغیر کسی تحقیق کے جناب آغا شاعر کو "رباعیات خیام" کا سب سے بڑا مترجم کہنا انصاف کی بات نہیں ہے۔"

ہاں ہم جانتے ہیں کہ فرانسیسی زبان میں نیکلا، شارل گرولو، کلوڈ انہ، فرنند ہنری، لاسکارلیس، جس مارک بزنرٹ، شارل سیبلامی، و: اکرنا، رابرٹ ڈلیک ژول ڈی مارٹولڈ، اور فراز توسں، کے ترجمے بہت اچھے سمجھے جاتے ہیں انگریزی میں وینفیلڈ، جونسن، لوئزا، کاسٹلو، جان گارنر، ایڈورڈ برن انہ ناتھ ہیکل، شر لبسبیل، اور میک گربھی کے ترجمے بھی بیجا نہیں تصور کئے جاتے،

جرمنی زبان میں وان شاک فریڈرک روزن اور ولف قابل قدر مترجمین تسلیم کئے جاتے ہیں، اطالوی زبان میں جے ٹیز اور اوگارلی کے ترجمے بہت مشہور ہیں، ہسپانوی زبان میں ویس پاستو کا ترجمہ سب سے اچھا مانا جاتا ہے، روسی زبان میں اومف اور ٹمار بوف کے ترجمے نادر سمجھے جاتے ہیں، ترکی زبان میں ڈاکٹر عبداللہ جودت، رضا توفیق اور حسین دانش بہترین مترجم شمار کئے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں ودیع بستانی محمد رباحی اور سید احمد نجفی کے ترجمے کامیاب کہے جاتے ہیں۔

مگر یورپ میں جس ترجمے نے خیام کو آج اس رتبے کو پہنچایا ہے وہ جیرلڈ ہی کا ترجمہ کہا جاتا اور سمجھا جاتا ہے، اور رباعیاتِ خیام کا جو سب سے بڑا مترجم یورپ میں مانا جاتا ہے وہ فٹز جیرلڈ ہی ہے، لہذا اسی لئے ہم نے یورپ کے سب سے بڑے مترجم سے ہی آغا شاعر کا مقابلہ کیا تھا، تاکہ مقابلتاً اسی کے پلے کا جو توازن قائم ہوگا اسی سے بقیہ ترجموں اور مترجموں کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ لہذا یہ سمجھنا کہ ہمیں دیگر زبانوں کے ترجموں کی خبر نہیں ہے یا یہ کہ ہم نے اس کی خبر نہ رکھ کر ایسا فیصلہ کیا ہے لغو ہے۔

کاشی پریاگی کے اردو ترجمے کے متعلق سکسینہ صاحب نے فرمایا ہے کہ "جناب کاشی پریاگی کا اردو ترجمہ جس کے متعلق جناب عطاء اللہ پالوی صاحب کا خیال ہے کہ وہ بہت مشہور ہے میری نظر سے ابھی تک نہیں گذرا۔

کیا ساری مشہور چیزیں آپ کی نظر سے گذر چکی ہیں؟ نیز کیا آپ کی نظر جب تک اس پر نہ گذرے کوئی چیز مشہور نہیں ہو سکتی یا نہیں کہی جا سکتی؟ کتنی افسوس ناک بات ہے

کہ سکینہ صاحب ایک ہندوستانی ہیں اور وہ بھی صاحبِ علم، اگر وہ مشرق سے اتنے دور اور ہندوستانی ادب سے اتنے بے خبر ہیں کہ ان کی نظر سے اب تک کاشی پرباگی کا ترجمہ نہیں گذرا اور وہ ہمارے قول کو صحیح باور کرنے میں پس و پیش فرما رہے ہیں، لیکن مغرب سے اتنے نزدیک اور یورپین ادب سے اتنے قریب ہیں کہ اُس کے ہر ادب سے باخبر ہیں اور اُس کے کسی لفظ کو بھی نادرست تسلیم کرنے پر تیار نہیں، بہر کیف ہم دقتوں کو سمجھتے ہیں۔ دراصل سکینہ صاحب انگریزی زبان کے ماہر ہیں اور انہوں نے رباعیاتِ خیام کو صرف فٹز جرلڈ ہی کے قلم و دماغ کے ذریعے جانا اور سمجھا ہے، پھر وہ آغا شاعر مرحوم کے ترجمے کی افضلیت کیسے گوارا کر سکتے ہیں؟ چنانچہ دیکھئے نا، یہ کہنے کے باوجود کہ،

"ممکن ہے جیسا کہ جناب عطاء اللہ صاحب کا خیال ہے کہ وہ رباعیاتِ خیام کے سب سے بڑے مترجم کہے جانے کے مستحق ہوں، کیونکہ ظاہر ہے کہ جتنا ہر اعتبار سے اچھا ترجمہ ایک فارسی شعر کا اردو زبان میں ہو سکتا ہے اُتنا اچھا کسی دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔"

وہ اپنے جذبات پر قابو نہ حاصل کر سکے اور یہ بھی فرما ہی دیا کہ :-

"جناب عطاء اللہ صاحب نے شاید بہت ہی سطحی نظر سے اُس کو دیکھا ہے، ورنہ وہ اسقدر سخت الفاظ کہ "جرلڈ کا ترجمہ سب سے زیادہ مہمل اور ناقص ہے" استعمال نہ کرتے"

آخر میں ہم سکینہ صاحب سے عرض کرینگے کہ درحقیقت رباعیاتِ خیام کا جس زبان میں سب سے بہتر ترجمہ ہو سکتا ہے وہ "اردو" ہے اور اردو میں جو سب سے اچھا مترجم ہے وہی رباعیاتِ خیام کا سب سے بڑا مترجم ہے، اور اس حیثیت سے یہ واقعہ ہے کہ آغا شاعر "رباعیاتِ خیام" کے سب سے بڑے مترجم ہیں۔

(منقول از چمنستان مارچ ۱۹۳۱ء)

ایک قدیم مشاعرہ

(ایک فرشی مشاعرے کی یاد)

شیخ غلام رسول

آج سے پچاس سال پیشتر کی بات ہے کہ لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں ایک فرشی مشاعرہ ہوا تھا جس کی یاد ابھی تک دل میں کروٹیں لیتی ہے، یہ مشاعرہ طرحی تھا، ایک مصرع طرح تو امیر مینائی کی معروف غزل کا تھا، ع

ہر وار پہ کہتا ہے وہ ظالم کہیں مر بھی — اور دوسرا مصرعہ ایسا تھا جس کے ردیف قافیہ "جہاں رہے" "کہاں رہے" تھے، ہال میں دریوں کے اوپر سفید چاندنیاں بچھی تھیں اور ایک طرف جناب صدر کے لئے قالین اور گاؤ تکیے کا انتظام تھا، پھر منتظم مشاعرہ خان بشیر حسین خاں نے پان گلوری کا بھی وافر انتظام کر رکھا تھا۔ لاہور میں ایسا مشاعرہ ایک عرصے کے بعد ہوا تھا، اس مشاعرے سے پیشتر تو غالباً وہی مشاعرے ہوئے ہوں گے جو مولانا محمد حسین آزاد کے زیر نگرانی ہوا کرتے تھے، سامعین کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ہال میں تِل دھرنے کے لئے بھی جگہ نہ تھی۔

مشاعرے کے لئے لاہور کے ایک مقتدر رئیس راجہ نریندر ناتھ سابق کمشنر لاہور تھے، وہ کشمیری پنڈتوں کے خاندان کے سرکردہ بزرگ تھے نہایت منکسر المزاج اور شیریں کلام، اردو بھی صحیح نہیں بولتے تھے، فارسی بھی بے تکلف بولتے تھے، خواجہ حافظ شیراز اور میرزا غالب کا کلام اُن کے نوکِ زبان تو تھا

جب کبھی راجہ صاحب اپنے دوست نواب محمد علی قزلباش اور سرکارِ علامہ شیخ عبدالعلی صاحب ہِروی سے ملنے آیا کرتے تو فارسی ہی میں گفتگو کرتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کشمیری پنڈتوں کے گھروں میں بھی باہمی فارسی ہی بولی جاتی تھی اور ہندوؤں کے علاوہ سکھ رئیس بھی گلستاں بوستاں پڑھے ہوتے تھے۔ ہمارے طالب علمی کے زمانے (۱۹۱۴ء) میں کئی ہندو اور سکھ طلباء ہمارے ہم جماعت تھے اور ابوالفضل کے خطوط و سکندر نامہ پڑھنے میں ہمارے شریکِ سبق ہوا کرتے تھے۔

اِس مشاعرے میں ایسے شعراء بھی تھے جو واقعی آسمانِ شعر کے درخشندہ ستارے تھے۔ مثلاً حضرت داغ کے نامور شاگرد آغا شاعر قزلباش اور ان کے ہندو شاگرد راج نارائن ارمان تشریف فرما تھے، پھر علامہ ڈاکٹر اقبال بھی شریکِ مجلس تھے۔ ایک صاحب حیدرآباد دکن سے اور دوسرے صاحب رضی دہلی سے تشریف لائے تھے۔ لاہور کے خان احمد حسین خاں جج اور مولوی تاج صاحب بھی موجود تھے اور مشاعرے کی رونق بڑھا رہے تھے۔

آغازِ کار۔ مشاعرے کا افتتاح غالب کی معروف غزل سے ہوا۔

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟

نہ ہو جب، دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مولانا محمد بخش صاحب مسلم کا آغازِ شباب تھا، غالباً میٹرک میں پڑھا کرتے تھے، ماشاء اللہ کیا نورانی حلیہ تھا پھر خوب شیریں آواز تھے ایسے نستعلیق انداز سے غزل پڑھی کہ لوگوں کے سر ہل گئے۔ مولانا نے غزل پڑھتے

ہوئے ایک شعر یہ بھی پڑھا ؎

یہ مصرعہ لکھ دیا ظالم نے میری لوحِ تربت پر
جو ہو فرقت کی بے تابی تو یوں خوابِ گراں کیوں ہو؟

اب ہم کیا عرض کریں کہ اس شعر پر کس قدر داد دی گئی، غزل کے ختم ہونے پر آغا شاعر نے بتایا کہ یہ شعر دراصل اُن کے استاد حضرت داغؔ کا ہے۔

ایک دو مبتدی شاعروں کے بعد جنابِ تاجؔ نے اپنی غزل سنائی، وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور روزمرہ بھی خوب جانتے تھے، ان کی ایک غزل ان دنوں بہت مشہور ہو رہی تھی، جس کا مطلع یہ تھا،

یہ دعا ہے آتشِ عشق میں مری طرح تو بھی جلا کرے

گانے والیاں اس غزل کو لے اڑی تھیں اور اپنے مجروں میں گا کر خوب نقد خراجِ تحسین وصول کیا کرتی تھیں۔ اس کے تین شعر اب تک میرے کشکول میں محفوظ ہیں، ملاحظہ فرمائیے،

یہ دعا ہے آتشِ عشق میں مری طرح تو بھی جلا کرے
نہ نصیب ہو تجھے بیٹھنا، ترے دل میں درد اٹھا کرے
رہے نامراد رقیب بھی، نہ خدا دکھائے اُسے خوشی
نہ نصیب شربتِ وصل ہو، سدا رنج و غم ہی پیا کرے
پلٹ آئیں خیر سے پھر وہ دن، تجھے چین آئے نہ میرے بن
تجھے بس گلے سے لگاؤں نہ، مری منتیں تو کیا کرے

تاج صاحب کے بعد راج ناراین ارمانؔ تشریف لائے، پنڈت جی خوب

قد آور انسان تھے، چوڑا چکلا چہرہ اور بڑی بڑی مونچھیں، آواز پاٹ دار تھی اور کلام میں اپنے اُستاد کا رنگ چوکھا تھا، اُن کی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

وعدے پہ تم نہ آئے تو آئی نہ موت بھی — دونوں ہی بلا بلا کے نہ جانے کہاں رہے

یہ راز خود ہی اپنی نگاہوں سے پوچھ لو — میں کب یہ کہہ رہا ہوں کہ شب بھر کہاں رہے

ایک ایک شعر پر خوب داد ملی۔ خصوصاً دوسرے شعر کو تو کئی بار پڑھوایا گیا۔ آرمان صاحب جھک جھک کر تسلیم بجا لا رہے تھے۔

جناب حیدر آبادی صاحب کا کلام بھی خوب رہا اور پھر جناب رضی صاحب کے کلام پر تو حاضرین نے خوب داد دی، اُن کی غزل کا مقطع ملاحظہ ہو،

رضیؔ شباب جو کھو یا گیا ہے پیری میں — اسی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں سر جھکائے ہوئے

اب علامہ اقبالؔ تشریف لائے، علامہ مرحوم اس زمانے میں بیرسٹری کرتے تھے، مگر شاعری میں ان کا مقام بہت اونچا ہو چکا تھا، اس لئے لوگ ان کا کلام سننے کے لئے بے تاب تھے، یہ علامہ کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا مسکراتا ہوا چہرہ، انار کے دانے کی طرح سرخ رنگ، بہت شاندار مونچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اُن کے سر پر بہت زیب دیتی تھی، علامہ اپنا کلام عموماً ترنم سے سنایا کرتے تھے، اس محفل میں انہوں نے اپنی غزل تحت اللفظ ہی سنائی، مگر اس خوبی سے کہ ترنم اُس پر نثار تھا، ؎

بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور — جو اس چمن سرا میں بلند آشیاں رہے

یہ شعر نئے انداز کا تھا، علم دوست حضرات اس سے بہت محظوظ ہوئے اور خوب داد دی، دوسرا شعر ملاحظہ ہو،

پیریٔ شباب ہے جو تمنّا جواں رہے　　موقوفِ آرزو ہے، توانائیِ حیات

اس شعر پر بے پناہ داد ملی، بلکہ یہ شعر کئی بار پڑھوایا گیا، آغا شاعر صاحب کی ادا نرالی تھی، کھڑے ہو کر داد دی اور شعر کو بہت سراہا، علامہ مرحوم کی یہ غزل "بالِ جبریل" میں چھپ چکی ہے۔ راقم نے اسے اپنے کشکول سے نقل کیا ہے،

اب جناب آغا شاعر صاحب کی باری تھی، آغا صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا، ناک نقشہ بلا کا تھا، خوب حسین انسان تھے، ان کی غلافی آنکھیں ہمیشہ مخمور نظر آتی تھیں۔ مغلئی تمدن کی چلتی پھرتی تصویر تھے، گرم اچکن پہنے ہوئے تھے، سر پر سفید عمامہ بندھا تھا۔ آغا صاحب کو ہم نواب محمد علی خاں قزلباش کی مجلس میں مرثیہ پڑھتے تو دیکھ چکے تھے، مگر غزل سننے کا اتفاق اب ہوا، جب کلام پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو محفل کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے حاضرین کا جائزہ لے رہے ہوں، پھر فرمانے لگے،

"حضرات! میں اپنا کلام پڑھنے سے پیشتر اپنے استاد غفران مآب مرزا داغ علیہ الرحمۃ کا کلام تبرکاً پڑھا کرتا ہوں، ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:"

کعبے کی ہے ہوس، کبھی کوئے بتاں کی ہے　　مجھ کو خبر نہیں، مری مٹی کہاں کی ہے

یہ شعر اس انداز اور اس دبدبے سے پڑھا کہ سراپا داد بن گئے، دوسرا مصرعہ ہاتھ اٹھا کر ایسے طریقے سے ادا کیا کہ جواب نہیں۔

جب دوسرا شعر پڑھا تو واللہ قیامت ہو گئی اور دیر تک داد ملتی رہی، اس کے بعد آغا صاحب نے اپنی غزل سنائی، داغ کا رنگ غالب تھا، اور کچھ

شعروں پر خوب داد حاصل کی، اُن کا ایک شعر جو حافظے میں محفوظ ہے ملاحظہ ہو،

لیلیٰ، کبھی مجنوں ہے بگولے کے بدن میں ⁂ اب خاک میں تو مِل چکا، محمل سے اُتر بھی

اپنی غزل سنانے کے بعد آغا صاحب نے فرمایا کہ اس زمین میں حضرت داغؔ کے کہے ہوئے دو شعر مجھے یاد ہیں، آپ حضرات کی ضیافتِ طبع کے لئے کہے دیتا ہوں۔

وہ صبح کو اُٹھتے ہی ملا لیتے ہیں صورت ⁂ آئینہ بھی رہتا ہے مقابل، گُلِ تر بھی

ذرا اس شعر کے تیور ملاحظہ ہوں "آئینہ بھی رہتا ہے مقابل، گُلِ تر بھی"

دوسرا شعر ملاحظہ ہو

سچ کہہ دو نکل بھاگے ہو قابو سے یہ کس کے؟ ⁂ لب خشک ہیں اے جان، پسینے میں ہو تر بھی

ذرا زبان اور معاملہ بندی ملاحظہ ہو، وہ داد ملی کہ کیا ٹھکانہ ہے، اُس زمانے کی شاعری پر بعض حضرات ناک بھوں چڑھاتے ہیں، مگر عرض یہ ہے کہ تب تو ہماری شاعری ارتقائی منازل طے کر رہی تھی اور ہر قسم کا مضمون شعروں میں لانے کا شوق تھا، خصوصاً اس قسم کا روزمرہ تو بہت پسندِ خاطر ہوتا تھا، بے شک آجکل شاعری عروج پر ہے، اور اعلےٰ سے اعلےٰ کلام سننے میں آتا ہے مگر مؤدبانہ عرض ہے کہ ہم جیسے "اگلے وقتوں کے لوگ" تو کچھ روزمرہ پر ہی جان دیتے ہیں، مقامِ افسوس ہے کہ ایسے شعرا اب خال خال ہی نظر آتے ہیں جو یوں کہیں،

ہم تم سے آ ملے، کبھی دشمن سے جا ملے ⁂ ایسا مزاج ہو، تو کوئی تم سے کیا ملے؟

اور پھر یہ شعر بھی سنتے جائیے۔ ہائے مجبوریاں محبت کی ⁂ حال کہنا پڑا ہے دشمن کا

او لیجئے اب یہ چھیڑ مضمون اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔

یوں ہم کو چھیڑتے ہیں جوانانِ میکدہ ⁂ مائل بہ تجھے سلام کہا ہے بہار نے

(منقول از ہفت روزہ "لاہور" لاہور، ۱۳ جنوری ۱۹۶۴ء)

ممتاز رباعی نگار

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

آغا شاعر قزلباش دہلوی کا نام رباعی نگار کی حیثیت سے یوں یادگار رہے گا کہ انہوں نے فارسی کے ممتاز ترین رباعی گو شاعر عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ اردو رباعی میں کیا ہے، عمر خیام کی رباعیات کا یہ منظوم ترجمہ "میخانۂ خیام" کے نام سے شائع ہو کر عرصہ ہوا منظر عام پر آچکا ہے۔ اس میں ساڑھے چھ سو رباعیاں شامل ہیں، عمر خیام کی رباعیوں میں اتنی غنائیت، دلکشی اور اثریت ہے کہ انہیں ترجمہ کی غرض سے ہاتھ لگانا بڑا مشکل ہے، ترجمہ یوں بھی چونکہ نقش دوم کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں نقش اول کے حسن و اثر کو قائم رکھنا آسان نہیں ہے غیر کے احساسات و جذبات کی ترجمانی اس وقت تک ممکن ہی نہیں، تاوقتیکہ مترجم و مصنف کی فنی صلاحیت میں ایک طرح کی باہم مطابقت نہ ہو، شعر کے ترجمے میں چونکہ حرف لطیف و نازک احساس سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس لئے یہ کام نثر کے ترجمے کے مقابلے میں اور دشوار ہو جاتا ہے۔

آغا شاعر دہلوی کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کو بے کیف اور بے رس نہیں ہونے دیتے، چنانچہ ان کی اکثر رباعیوں میں کچھ ایسی غزلیت، حیات خیزی، رومانیت اسلوب کی دلکشی اور فنی پختگی نظر آتی ہے کہ وہ عمر خیام کی رباعیوں کی چغلی نہیں کھاتیں، اس جگہ ہم چند رباعیاں نقل کرتے ہیں ساتھ ہی عمر خیام کی اصلی رباعیاں

بھی دی جارہی ہیں تاکہ ترجمہ کے حُسن کو محسوس کرنے میں مدد ملے۔

خیام

گر مے نہ خوری طعنہ مزن مستاں را
گر دست دہد، توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدیں کنی، کہ من مے نہ خورم؟
صدکار کنی، کہ مے غلام است آں را

(ترجمہ) آغا شاعر

طعنہ نہ دے مستوں کو جو پی سے ہے حذر
ہم توبہ بھی کرلیں گے، مشیّت ہے اگر
ہے فخر یہی نا؟ کہ تو مے خوار نہیں
سو عیب ہیں اور مے سے بدتر بدتر

خیّام

ہر چند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا
چوں لالہ رُخ و چوں سروِ بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طرب خانۂ خاک
نقاشِ ازل از بہر چہ آراست مرا

آغا شاعر

قدرت نے مجھے حُسن دیا تھا کیسا
رُخ پھول سا قد سرو سا، پیارا پیارا
پر یہ نہ کھلا کہ خاک کرنے کے لئے
نقاش نے یہ نقش سنوارا کیوں تھا؟

خیّام

ہر روز بر آنم کہ کنم شب توبہ
از جام و پیالہ لبالب توبہ
اکنوں کہ رسید وقت گل ترکم دہ
در موسمِ گل ز توبہ یارب توبہ

آغا شاعر

کرنیکو ہوں تیار نہیں ہر شب توبہ　　ازجام و پیالۂ لبالب توبہ
اب وقت بہار آگیا کچھ دن مہلت　　اس موسم گل میں توبہ؟ یارب توبہ

خیام

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما　　کے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے　　زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

آغا شاعر

آئی یہ ندا صبح کو میخانے سے　　اے رند شراب خوار دیوانے سے
اٹھ جلد شراب سے ساغر بھرلیں　　کمبخت چھلک جائے نہ پیمانے سے

(منقول از اُردو رباعی)

پیارا دوست

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

افسر الشعرا، آغا شاعر دہلوی میرے پیارے دوستوں میں تھے، اُن سے بارہا دلی، لاہور اور شملے میں ملاقاتیں ہوئیں اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا، وہ جہاں کہیں بھی رہتے میں وہاں ہوتا تو ضرور ملتے، ان کی بے وقت وفات سے مجھے دوہرا صدمہ ہوا، ایک تو یہ کہ ایک مخلص دوست کی صحبت سے محروم ہوا، اور دوسرے یہ کہ ادب و شاعری میں ایک ایسی جگہ خالی ہوئی جس کا پُر کرنا اللہ میاں ہی کا کام ہے، مرحوم کی زندگی کے اسی پہلو پر اس مختصر تحریر میں کچھ روشنی ڈالی جائے گی۔

جتنے اچھے اور زیادہ شاگرد فصیح الملک مرزا داغ کے فیضِ اصلاح سے مستفید ہوئے، اُتنے اور ویسے شاید ہی کسی استاد کے حصے میں آئے ہوں اس جمِ غفیر میں شاعر کی جگہ اُن چند ارشد تلامذہ میں تھی جنہیں اُستاد کے طرز کی پیروی کا شرف حاصل تھا۔

شاعر مرحوم تخیّل کی تہذیب، الفاظ کی دلآویزی، اسلوب کے بناؤ چناؤ، کلام کی خیرینی اور محاورے کی صحت میں اپنے اُستاد کے سچے پیرو تھے۔ شاعر کی شاعری کا تخیّل اونچا تھا، مگر اس جناتی بلندی کا نہیں جو نظر کو خیرہ اور ٹوپی کو پادر ہوا کر دے۔ اُن کی فکر گہری تھی مگر ایسی نہیں کہ انسان کی فہم کو

چراغ پا کر دے، اُن کے بیان میں مٹھاس تھی لیکن گلو سوز نہیں کلاسیکل غزل کی قریباً تمام ضروریات ان کے اشعار میں موجود تھیں، انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور اچھی کہی ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کو انہوں نے اپنے شاگرد رشید مہاراج بہادر برق دہلوی کے سپرد کر دیا تھا، اور خود غزل کے احیاء میں مصروف رہے۔ مشاعروں میں پڑھنے کا طرز اگرچہ محض تحت اللفظ تھا مگر نہایت مؤثر، لہجہ بہت دلاویز تھا، ہاتھ اور تیور سے بھی کام لیتے تھے لیکن صرف اتنا کہ شعر کے موضوع کی سہانی شرکت ہو جائے اور کتھک کے اوبھاؤ سے دور رہے، میں نے اُن کے اُستاد حضرت داغ کو مشاعروں میں حالی اور مجروح وغیرہ مشاہیر کے ساتھ سنا ہے اور اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ داغ کے پڑھنے کا انداز سب سے نرالا اور سہانا اور مؤثر تھا۔ اُن سے بہتر پڑھنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ بعد کے شعراء میں یہی فیصلہ میرا شاعر مرحوم کے حق میں ہے

خدا بخشے شاعر کا مزاج ایسا واقع ہوا تھا کہ ذرا سی بات میں بگڑ جاتے مگر فوراً اس بات کو بھول بھی جاتے، اُن کا روٹھنا اور من جانا ایک نہایت سہانی معصومیت لئے ہوئے تھا۔

متأخرین میں امیر و داغ کے شاگردوں نے اُن اُستادوں کے بعد غزل اور شاعری کو جس طرح سنبھالے رکھا اس کا تذکرہ ادب کی تاریخوں میں موجود ہے، ان میں آغا شاعر کی ادبی خدمت کا حصہ کسی سے کم نہیں۔

(منقول رسالہ چمنستان دلی)

استفسار و تعزیت

گاندھی جی

سیگاؤں وردھا - ۱۱ر ستمبر ۳۹ء

پیارے اقبال -

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کے والد عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر شدید بیمار ہو گئے ہیں،

میری دعا ہے کہ خدا انہیں جلد تر صحت یاب کر دے -

ایم - کے - گاندھی (ایک خط)

سیگاؤں - وردھا - ۹ر مئی ۴۰ء -

پیارے اقبال - مجھے آپ کے محترم والد آغا شاعر دہلوی کی وفات کی رنجیدہ اطلاع مل گئی تھی، مگر تمہارا پتہ نہیں معلوم تھا - میں سوچتا رہا کہ تم لوگوں کو اپنی تعزیت کس طرح بھیجوں، اس کا موقع مجھے اب مل گیا اور میں پورے خاندان کو تعزیت بھیج رہا ہوں -

تمہارا مخلص

ایم - کے - گاندھی

انگریزی خط سے ترجمہ

(منقول از شعلہ و شبنم ۱۹۵۳ء)

آغا شاعر کی شاعری پر ایک نظر

مجتبیٰ حسین

داغ کے اٹھ جانے کے بعد ایک خاصہ اہم سوال یہ تھا کہ اب شاعری کون سی راہ اختیار کرے گی - آزاد اور حالی کی کوششوں اور بدلتے ہوئے معاشرتی اور معاشی حالات نے بڑی حد تک اس راہ کی طرف واضح اشارے کر دیئے تھے جس سے شاعری گذرنے والی تھی، پھر بھی لوگوں کے شعری مزاج میں غزل اس طرح رچ گئی تھی کہ اس وقت مستقبل کی اردو شاعری کا چہرہ پوری طرح سامنے نہیں آسکتا تھا، داغ کی آواز پورے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ان کی شاعری کی شوخی، طراری، عشوہ گری، اردو زبان و محاورہ کی دلاویزی لوگوں کے دلوں کو اس طرح موہ چکی تھی کہ خلوت و جلوت میں اٹھتے بیٹھتے انہیں کے اشعار پڑھے جاتے - داغ کی شاعری تہذیبی زندگی اور مجلس آرائی کا ایک جزو لازم بن گئی تھی، یہ اس محفل میں جو دھیرے دھیرے سمٹا جڑتی چلی جا رہی تھی تھوڑی دیر ہی کے لئے سہی، لطفِ سخن اور گرمیٔ محفل کا باعث بن جاتی۔ اسی لئے داغ کے بعد دلدادگانِ شعر کے ذہنوں میں یہ سوال گونج رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

یہ سوال دلّی کے شعراء کے لئے جن میں سے بیشتر کو داغ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا

خاص طور سے اہم تھا، اس سوال کے دو پہلو تھے، داغ کے بعد داغ ہی کے رنگ میں شاعری کی جائے یا اس سے ہٹ کر، اور یہ دونوں پہلو ایسے نہیں تھے کہ آسانی سے جن کا جواب مل جائے، پہلی صورت میں داغ کے رنگ میں شعر کہنا اور اپنے کو معتبر بنانا بہت مشکل کام تھا، اس کے لئے صرف داغ کی شاگردی یا مشاقی کی ہی ضرورت نہ تھی، بلکہ خود بھی اُستاد ہونے اور اپنی بات کے لئے اپنا لہجہ پیدا کرنے کی بھی ضرورت تھی - داغ کے رنگ سے ہٹ کر کہنا بھی بہت مشکل تھا، اس جرأت کے لئے اس عہد کی رائج اور مقبول غزل گوئی سے کچھ آگے کے شعور کی بھی ضرورت تھی، آغا شاعر کے ہاں جو داغ کے ممتاز ترین شاگرد ہیں، یہ دونوں مشکلیں حل ہوتی نظر آتی ہیں انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور غزل کے دائرے سے باہر قدم نکال کر معاشرتی مسائل پر بھی غور کیا ہے اور نظم کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے، غزل سے اور وہ بھی داغ اسکول کی غزل سے قدم باہر رکھنا اور نظم کے خارزار میں پہنچنا بڑی جانکاہی، حوصلے اور حقیقت شناسی کا کام تھا، آغا شاعر میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ زمانے سے بھاگنے کے قائل نہ تھے - داغ کی شاگردی نے ان کی شاعری پر دھار ضرور رکھ دی تھی لیکن اس کے بعد وہ جو کچھ تھے اور جو کچھ ہوئے وہ اپنی ہی کوششوں اور جودتِ طبع کے باعث وہ اپنی ایک مستقل ادبی شخصیت رکھتے تھے، وہ شاعر بھی تھے، مترجم بھی تھے، نظم نگار بھی تھے، ڈرامہ نگار بھی تھے، اخبار نویس بھی تھے اور مضمون نگار بھی تھے، ان کی زندگی کے واقعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی یہی تنوع تھا، وہ بڑے سادہ دل اور بھولے آدمی تھے، دوستوں سے

ٹوٹ کر ملتے تھے، ان کے لئے بچھ جاتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ ان میں بانکپن اور خودداری بھی تھی، سپاہیانہ آن بان کے ساتھ درویشی کی شان بھی پائی جاتی تھی، عاشق مزاج اور رنگین طبع ہونے کے باوصف بڑے مذہبی آدمی تھے، گوشہ نشین بھی تھے اور سیر وسفر کے دلدادہ بھی، پرانے زمانے کے شیدائی ہونے کے باوجود نئے عہد سے بھی بے خبر نہ تھے، اور آخری بات یہ کہ دلی کے عاشق تھے دلی ان کی سانس تھی، دلی ان کی تہذیب تھی، دلی ان کی زبان تھی، دلی ان کی جان تھی، وہ دلی کے تھے اور دلی ہی نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا، دلی کے بارے میں کس محبت کے ساتھ اور فخریہ طور پر انہوں نے کہا ہے۔

یہ دلی وہ ہے زمین آسمان کا دل تھا
یہ دلی وہ ہے کہ تاج ونشان کا دل تھا
یہ دلی وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا
یہ دلی وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
یہی تو علمی مشاغل سے شہر روشن تھی
یہ خاک وہ ہے جو علم و ہنر کا معدن تھی

آغا شاعر کی ادبی اور ذاتی زندگی کا یہ تنوع ہم آہنگی رکھتا ہے، اسی لئے ان کی شاعری میں بیک وقت کئی رخ ملتے ہیں، داغ کی زبان کی شوخی اور بانکپن میں انہوں نے اپنی شخصیت کی شوخی اور بانکپن کو ملا دیا اور اس طرح ان کی غزلیں دو آتشہ بن گئی ہیں۔ یہ شعر دیکھئے قدیم رنگِ سخن کو کس قدر تیز کر کے کہا ہے ؎

ابرو نہ سنوارا کرو، کٹ جائے گی انگلی ٭ نادان ہو، تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

اور اس کے بعد ان اشعار میں موسم برشگال کے ساتھ زبان کی مستی بھی دیکھیے۔

کبھی ساون کی جھڑی ہو کبھی بھادوں برسے ایسا برسے مرے اللہ کہ چھپا جھاں برسے

کہدو یہ میکشوں سے نہ پینا عذاب ہے ساون برس رہا ہے ہوا میں شراب ہے

اور پھر یہ شعر دیکھیے، جو زبان سے آگے کی چیز ہے، اور جس میں آغا شاعر نے اس جرأت سے کام لیا ہے جو داغ کے عہد میں مفقود نظر آتی ہے۔

جو برق و باد پہ قادر، وہ اس قدر مجبور

کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

"خدا" کے سلسلے میں یوں سوچنے کے انداز داغ کے بعد ہی بالعموم آسکتا تھا زبان کی دلآویزی اور بندش کی چستی بھی اس شعر کی تلخی کو کم نہ کر سکی۔

آغا شاعر کی پوری شاعری میں خواہ وہ غزل کہہ رہے ہوں یا نظم، دو چیزیں بڑی نمایاں ہیں، ایک تو یہی سامنے کی چیز ہے جسے ہم زبان کی صفائی کہہ سکتے ہیں، دوسرے ان کی وسیع النظری، زبان کی پختگی، اور قادر الکلامی، ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے غزل میں جو زبان شوخ، صاف اور چٹپٹی ہے وہ نظموں میں پہنچ کر ایک نئے انداز سے ابھرتی ہے ان کی غزلوں میں بول چال کا انداز جا بجا ملتا ہے، جو مصرعوں میں پختگی اور برجستگی پیدا کرنے کے علاوہ ایک ہی شعر کے کئی رخوں کو بڑی فصاحت سے پیش کر دیتا ہے، زبان کے اس بے تکلف انداز اور مصرعوں میں مختلف موڑ کو دیکھیے۔

حشر میں انصاف ہوگا، بس یہی سنتے رہو

کچھ یہاں ہوتا رہا ہے، کچھ وہاں ہو جائے گا

تم بھلا کون تھے، دل میں مرے آنے والے؟
دیکھنا، جان نہ پہچان، چلے آتے ہیں
کسی کے روکنے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے
بہار آئی، چلا میں، یہ دھری ہیں بیڑیاں میری
اِک دن برس پڑو گے ہمیں پر، یہ کھل گیا
کب تک بھرو گے روز مری جاں بھرے ہوئے

یہی زبان نظموں میں پہنچ کر مشاہدے اور مطالب کو کامیابی سے ادا کرنے کا بڑا قوی ذریعہ بن جاتی ہے، ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں، جس میں انقلاب روزگار کے ہاتھوں امراء اور شرفاء کی اولاد کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا، صورت حال یہ ہے کہ رنج بھیک بھی اب تو غریبوں کو نہیں ملتی ہے اب اس کے بعد جدید عبرتناک تصور بھی دیکھیے۔

دربدر مضطر و بیکار، ہماری اولاد ❊ جاہل و کودن و لاچار ہماری اولاد
مفلس و کاہل و نادار، ہماری اولاد ❊ جان سے پھرتی ہے بیزار ہماری اولاد
مٹ گئے ایسے کہ اب کچھ بھی نہ چھوڑا باقی
دین ہی خیر سے ان کا ہے نہ دنیا باقی

کوئی چپراس لگائے ہوئے، چلمن بردار ❊ دن ٹوٹی پہ کھڑا ہے کوئی باندھے دستار
رات بھر کوئی، کہا کرتا ہے، جاگو، ہشیار ❊ کچھ ٹرمیوے کے ٹکٹ بیچتے ہیں برخوردار
کون کہتا ہے، کسی بات میں یہ ہیٹے ہیں
چھوٹے حضرت۔ بڑی سرکار کے یہ بیٹے ہیں

اس بند میں "برخوردار" کا قافیہ کس لطف، خوبصورتی، دبی ہوئی تلخی اور مشاہدے کی سچائی کے ساتھ صرف ہوا ہے، یہ زبان کا کمال تو ہے ہی، مگر اس میں دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ داغ اسکول کا شاعر "ٹریجڈی" تک پہنچ چکا ہے، اس نظم کا ایک بند اور دیکھئے، جہاں طنز آنسو میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے ؎

میرو مرزا کے گھرانے تھے جگت میں مشہور : ان کے فرزند قلی بن گئے، دیکھو مقدور
کچھ ڈبل روٹی پکا لیتے ہیں، چشم بد دور : پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں بہ ایں حسن و شعور

رات دن دیدۂ عبرت سے لہو بہتا ہے
خود یہ رو دیتے ہیں، مرزا جو کوئی کہتا ہے

ان مشکل مقامات سے گذرنے کے لئے زبان نے کتنا ساتھ دیا ہے، اس کا اندازہ ان بندوں سے بخوبی ہو سکتا ہے، لیکن یہ بند صرف اس لئے قابل توجہ نہیں ہیں کہ ان میں قادر الکلامی پائی جاتی ہے، ان کی اہمیت اس میں ہے کہ آغا شاعر نے اپنی عمر صرف غزل کے "حجلۂ عروسی" میں نہیں گذار دی، انہوں نے اس حجلے سے جھانک کر باہر بھی دیکھا ہے، جہاں بڑی بے کیفی، اداسی اور تھکن طاری تھی جہاں پھول مسلے ہوئے پڑے تھے، ان کی دیانت اور حق شناسی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ غزل کے حجلے میں بیٹھے وصل اور ہجر کے تصورات ہی سے کھیلا کریں، انہوں نے اس وقت کے ہندوستان پر نظر ڈالی جو غلام اور بھوکا تھا ان کے سامنے اس کا شاندار ماضی پھر گیا اور پھر وہ دکھ بھرے لہجے میں ماضی

اور حال کو برابر پیش کرتے رہے، ان کی نظم "بھارت ماتا کی فریاد" ان اشعار سے شروع ہوتی ہے ؎

وہ اسیرِ دامِ بلا ہوں میں جسے سانس تک بھی نہ آسکے
وہ قتیلِ خنجرِ ظلم ہوں جو نہ آنکھ اپنی پھرا سکے
مجھے آسماں نے مٹا دیا، مجھے ہر نظر سے گرا دیا
مجھے خاک ہی میں ملا دیا کہ نہ ہاتھ کوئی لگا سکے
مرے سور بیر کہاں گئے، وہ مہ منیر کہاں گئے
مرے قلعہ گیر کہاں گئے، جو کبھی پلٹ کے نہ آسکے

اور آخری شعر میں جوگی کی آواز آتی ہے ؎

بجے شاعر اس کی ہی بانسری، نہ رہے کسی کی نہ ہے رہی
یہ بڑی پھسلنی زمین ہے، یہاں پاؤں کوئی جما سکے

آغا شاعر کی اس قسم کی نظموں میں اگر ہم آج کا سیاسی شعور ڈھونڈیں تو وہ یقیناً نہیں ملے گا۔ یہ نظمیں سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے کہی گئی ہیں اور انہیں حدود میں انہیں رکھ کر دیکھنا مناسب ہوگا، ان کی اس نوع کی نظموں میں بار بار ہندوستان کا شاندار ماضی ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد موجودہ زبوں حالات کا بیان ملتا ہے اور پھر عمل اور اصلاح کی تلقین پائی جاتی ہے۔ ایک ایسے شاعر کے لئے جس کی شاعری غزل کے پھولوں سے معطر ہو، اس خزاں رسیدہ باغ کی طرف آنکلنا بڑی بات ہے۔

فنّی حیثیت سے ان کی نظمیں بیشتر بیانیہ اور محاکاتی ہیں، جن میں اجمال سے زیادہ تفصیل کا حسن ملتا ہے، اس دور کے بہت سے نظم گو شعراء کا انداز یہی تھا کہ وہ کسی ایک موضوع کو منتخب کرتے تھے، پھر اس کے نمایاں پہلوؤں کو خارجی انداز میں شاعرانہ توجیہات کے ذریعے بالتفصیل بیان کرتے جاتے تھے، اس طرح نظم اپنے بیانیہ تسلسل کے باعث فنّی تکمیل تک تو ضرور پہنچ جاتی، لیکن اس میں کوئی گہری فکر یا گہرا جذبہ کم ہی پایا جاتا تھا، اُن کی اسی نوع کی نظموں میں ڈہلیا کے چند بند ملاحظہ ہوں، جس میں حسنِ تخیل تفصیل میں جاکر اشعار کے پھول کھلاتی ہے۔

ایک نیا پھول ڈہلیا دیکھا ؛ صدقے اُترے ہزار میں لالا
لبِ معشوق پنکھڑی پہ فدا ؛ خانے خانے میں جس کے شہد بھرا
اللہ اللہ عجیب گلُ پھولا
ڈہلیا، تو نے دل کو لے ہی لیا

انُچھوئی پتیاں دو چند، سہ چند ؛ شاخ در شاخ نت نئے پیوند
اوُس کے موتیوں سے دولت مند ؛ کیا شگوفے ہیں کچھ کھلے، کچھ بند
بھاگئی تیری ایک ایک ادا
ڈہلیا، تو نے دل کو لے ہی لیا

آغا شاعر کی منظریہ شاعری میں بھی یہی رنگ ملتا ہے۔ انھوں نے

برسات کی گھٹاؤں، باغوں اور پھولوں پر صاف ستھری پاکیزہ اور دلکش نظمیں کہی ہیں، اور کبھی کبھی ان نظموں میں ایسے سبق آموز نتائج بھی ملتے ہیں جو اس وقت کے نظم گو شعراء کا ایک مخصوص طریقہ تھا، ان کی نظموں میں دل سوزی، مشاہدے کی سچائی، اور زبان کا لطف ملتا ہے، ان کی نظموں میں خواہ وہ سماجی ہوں یا منظری ایک مخصوص قسم کی ہندستانیت پائی جاتی ہے، ہندی کے ہلکے پھلکے خوبصورت الفاظ ان کی شاعری میں جابجا آتے رہتے ہیں، اور ہمیں بار بار احساس دلاتے ہیں کہ شاعر اپنی دنیا، اپنے ماحول اور اپنی زمین سے بڑا اُنس رکھتا ہے، آغا شاعر کی زبان کی طرح ان کا تخیّل بھی نمکین اور شیریں ہے، ان دونوں کے امتزاج سے اُن کی نظموں میں ایک خاص قسم کی چاشنی پیدا ہو گئی ہے، مجموعی حیثیت سے آغا شاعر کے کلام میں لطافت اور محبت کی تلاش ملتی ہے، ان کی زندگی اور ان کی شاعری، دونوں میں لطافت، پاکیزگی، حسن اور محبت کی جستجو پائی جاتی ہے۔ ان کی نظمیں ہم سے کہتی ہیں کہ اگر دل کشادہ ہو تو ہر چیز میں حسن مل سکتا ہے اور ہر چیز محبت کے قابل بن سکتی ہے۔ آغا شاعر کی پوری شاعری میں ہمیں دل کی یہ دولت مل جائے گی۔

(منقول از سبیپ کراچی مئی ۶۴ء)

بیادِ آغا شاعرؔ

تلوک چند محرومؔ

(۱)

بعد اُن کے ہوئے بہت سے پیدا شاعر ÷ لیکن نکلا نہ کوئی اُن سا شاعر
دہلی میں یاد آئے ہم کو اکثر ÷ فخرِ دہلی جناب آغا شاعرؔ

(۲)

نظم اور غزل میں جو جو ہیں یکتا شاعر ÷ پیدا ہوتا ہے کوئی ایسا شاعر
قادر تھے نظم اور غزل دونوں پر ÷ دہلی کے شاعروں میں آغا شاعرؔ

(۳)

انوارِ ازل کا ہو جو شیدا شاعر ÷ اک معنیٰ روشن ہے سراپا شاعر
ایسے ہی شاعروں میں ہے نام ان کا ÷ دہلی میں ہوئے ہیں وہ جو آغا شاعرؔ

(منقول از شعلہ و شبنم ۱۹۵۳ء)

عہد آفریں

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

جو برق و باد پہ قادر وہ اس قدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

تقریباً پچیس تیس برس کی بات ہے "مخزن" کے کچھ محفوظ پرچوں کی ورق گردانی کر رہا تھا، ایک پرچے کے آخری صفحات میں بعض مستند شعرا کے کلام کا انتخاب درج تھا، اس انتخاب میں حضرت آغا شاعر کا مندرجہ بالا شعر بھی شامل تھا۔

حضرت آغا شاعر کا نام سن رکھا تھا، شاید کبھی کسی رسالے میں ان کا کلام بھی دیکھا ہو، اب یاد نہیں۔ مگر یہ شعر پڑھتے ہی دل و دماغ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی، اور میں افسر الشعراء کی عظمت کا اسی وقت قائل ہو گیا۔ جبر و قدر کے خشک مسئلے پر دلی کی ٹکسالی زبان میں اتنا تر شعر دیکھنے اور سننے میں اس وقت تک نہ آیا تھا، صاحب انتخاب کے حسن انتخاب کی بھی داد دینی پڑی۔

بچپنے میں غالباً لاہور کی البرٹ تھیٹریکل کمپنی کے کئی ڈرامے دیکھنے کا موقع ہوا، اس زمانے میں والد مرحوم ملک الشعراء حضرت آفاق لکھنوی حیات تھے۔ ان کے ایک شاگرد موہن لال مطلب اس کمپنی کے ڈائریکٹروں میں تھے اور کمپنی کے ساتھ خود بھی لکھنؤ تشریف لے گئے تھے، بچپن میں جب والد مرحوم کے

ساتھ لاہور کی فضا میں سانس لیتا تھا تو مطلب صاحب کو دیکھا تھا،
بڑے بھاری بھر کم تھے، شاید پانچ چھ من سے کم وزن نہ ہوگا، ہمارے مکان
کی تنگ ڈیوڑھی سے ان کا نکلنا کچھ آسان نہ تھا، بہر حال یا تو مطلب صاحب
نے اس تنگ راستے کی چوڑائی کی مروّت سے اپنے موٹے پن کو دبایا، فربہی
کو سرکشی سے روکا، یا اس تنگ راستے نے ایک مہمان کے لئے کشادگی اختیار
کرنا ہی مناسب سمجھا۔

مطلب صاحب یقیناً خود شاعر نہ تھے، متشاعر تھے، کیونکہ ان کا
کلام میرے پاس محفوظ ہے، اس میں بوئے کسے می آید کی صورت نظر آتی
ہے، اور وہ بوئے کسے بوئے اُفق ہے اور کسی کی بو نہیں، تو اس کمپنی میں
ایک ڈرامہ "حورِ جنت" کھیلا گیا، ڈراما میں نے بھی دیکھا، تمام سین اب تک
نظر میں پھر رہے ہیں اس وقت کیا سمجھ تھی کہ اس ڈرامے کو لکھنے والا اردو
ادب کا ایک بہت بڑا شاعر ہے۔ اس طرح بچپن میں حضرت آغا شاعر سے میری
غائبانہ ملاقات "حورِ جنت" کے ذریعے ہوئی، اس کے بعد میں نے برق و باد
پر قدرت رکھنے والے انسان کی مجبوریوں کے ایک بے باک مبصر کی حیثیت
سے آغا شاعر کو جانا۔

۱۹۲۷ء میں جب آب و دانہ کھینچ کر لاہور لے گیا اس وقت میرے
پرانے دوست سابق مرزا یاس عظیم آبادی اور موجودہ حضرت یگانہ چنگیزی
بھی لاہور میں موجود تھے، اور حضرت اصغر گونڈوی بھی لاہور کے کسی ادبی ادارے
شاید مرکزِ اردو سے وابستہ تھے، منصبی حلقے کے ملاقاتیوں میں ایک کشمیری پنڈت

تھے، شعر کہتے تھے تخلص بانکے تھا، وہ افسر الشعراء کے تلامذہ میں سے تھے تر آدمی تھے، میری طرح خشک نہ تھے، اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت آغا لاہور تشریف رکھتے ہیں، اشتیاقِ دیدار دل میں چٹکیاں لینے لگا، حتّےٰ کہ ایک روز میں بانکے صاحب کے مکان پر پہنچا، حضرت آغا وہیں تشریف فرما تھے، جب میں پہنچا تو بھنگ گھوٹ رہی تھی۔ حضرت آغا شاعر اپنی مخصوص وضع قطع میں تھے، مجنونانہ کیفیت تھی۔ بانکے صاحب نے میرا تعارف کرایا تو دفعتاً طبیعت بھر آئی، اُٹھ کر میری طرف لپکے گلے لگایا، اور رو رو کر فرمانے لگے۔ خدا رکھے اس وقت اپنے دوست اُفقؔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی اور حیدرآباد کی وہ صحبتیں یاد آگئیں جن میں میں (یعنی حضرت آغا شاعر) اور اُفقؔ صاحب دونوں شریک ہوئے تھے۔

آغا صاحب کے دل میں والد صاحب کی یاد اب تک تازہ تھی، اور اتنی شدت کے ساتھ، اس کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، بہر حال مجھے بھی انہوں نے اُسی طرح گلے لگایا، جس طرح کوئی باپ اپنے بیٹے کو پیار کرتا ہے، اس نظارے نے مجھے بیحد متأثر کیا، ایک طرف آغا والد صاحب کا ذکر کر رہے تھے اور دوسری طرف اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، اس سے آغا صاحب کے خلوص محبت پر کافی روشنی پڑتی ہے، ان کا دل بیحد رقیق تھا، اُن کے دل میں اُن کے معاصرین کو کس قدر جگہ حاصل تھی، اس کا ثبوت مجھے لاہور میں ملا۔

دفعتاً آغا شاعر کے تیور بدلے، جب سامنے بھنگ کا گلاس پیش کیا گیا میں نے مجبوری ظاہر کی، کہنے لگے واللہ کیسے شاعر ہو، میاں ذرا اس کو چکھ کر تو

دیکھو، مگر جب انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ میرا شین، درست ہے نہ قاف، تو برس پڑے، خدا کی مار تم پر، کہاں باپ کے یہ شعر،

ہم اے اُفق نہ گرد رہیں کیوں شراب کے
دیکھو زمیں بھی پھرتی ہے گرد آفتاب کے

اور کہاں اُن کا بیٹا ان نعمتوں سے محروم،

بہر حال میری حالت پر ترس کھایا اور بڑی دیر تک اس خشک مشربی پر ماتم کرتے رہے۔

حکم ہوا، اچھا تو کچھ آفتاب کے لئے لکھا کرو، آفتاب نام کا ایک رسالہ اس زمانے میں نکلتا تھا، جس کے ایڈیٹر آغا کے شاگرد دیوان شرر تھے۔

جب دلی آیا تو حضرت آغا سے متعدد بار ملاقات ہوئی، اس زمانہ میں آغا کا بانکپن اپنی اداؤں کو رفتہ رفتہ خیر باد کہنے لگا تھا، ریاست جھالاواڑ سے اپنے قطع تعلق کی خبر حد درجہ درد و کرب کے ساتھ سنایا کرتے، آنکھیں بات بات میں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں، دہلی کے ایک مشاعرے میں غالباً میں نے ان کو پڑھتے ہوئے بھی سنا ہے، اگرچہ وہ مشاعروں میں شرکت سے بالعموم محترز رہتے تھے۔

آغا کے پڑھنے کا انداز عجیب تھا، لہجے میں رعب و تحکّم تھا مشاعرے پر چھا جاتے تھے، اُن کا تحت اللفظ پڑھنا ہزار ترنم ریزیوں پر بھاری تھا، سُننے والے ساکت ہو جاتے تھے، کسی میں دم مارنے کی جرأت نہ ہوتی، آغا شیر کی طرح محفلِ شعر و سخن میں گرجتے تھے، آغا کا اندازِ خواندگی اگر کسی نے اُن کے بعد

پایا تو وہ منشی مہاراج بہادر برقؔ تھے۔ آغا شاعر کو اپنے دہلوی تلامذہ میں اگر کسی پر فخر تھا تو مہاراج بہادر برقؔ پر۔

مجھے یاد ہے، جب ۱۹۳۶ء میں برقؔ صاحب کا انتقال یک بیک پانی پت میں ہوا اور اس کی خبر آغا صاحب کو ہوئی، تو وہ بالکل اس طرح سراپا ماتم تھے جس طرح کوئی باپ اپنے بیٹے کی دائمی جدائی پر زار زار سینہ کوبی کر رہا ہو۔ آغا کی وہ حالت میں نے دیکھی ہے، برقؔ کی موت کا اُن کو کتنا صدمہ ہوا، یہ اُن کی ایک تحریر سے ظاہر ہے جو ایک تعزیتی جلسے کے سلسلے میں آغا صاحب نے مجھے بھیجی تھی یہ جلسہ برقؔ صاحب کی وفات پر ہندو کالج میں مسز سروجنی نائیڈو کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔

اس کے بعد آغا صاحب کی نوازشیں براہِ راست مجھ پر کئی سال تک رہیں۔ میرے دوست شیو نرائن بھٹناگر نے جب اپنے روزنامۂ وطن کا سالنامہ شائع کرنا شروع کیا تو اس کے حصۂ نظم کی ترتیب میرے ہی سپرد کر دی، ملک کے مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کے دربار تک سائل کی حیثیت سے حاضر ہونے کا شرف مجھے وطن کی بدولت حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں ہر سال حضرت آغا کو تکلیف دیتا تھا اور وہ برابر میری درخواست قبول کرتے تھے، اگرچہ ان دنوں کچھ ناسازگار حالات، کچھ تنگ دستی، اور کچھ ضعیف العمری کے باعث ان کو اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں رہا تھا، پھر بھی جو کچھ انہوں نے قلم برداشتہ لکھا، وہ وطن کے حوالے کر دیا۔ شیو نرائن بھٹناگر کی ذات میں ہی کچھ عجب کشش ہے اُن کا حسنِ اخلاق سب کو بیک نظر رام کر لیتا ہے۔ آغا شاعر بھی شیو نرائن

بھٹناگر کے جوہرِ اخلاق سے مسخر ہو چکے تھے۔ وہ شیو نرائن کے اخبار وطن کو اپنا اخبار ہی کہتے تھے اور ہمارے اور آپ سب کے وطن یعنی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔"

عقیدتاً شیعہ تھے، حضرت علیؑ اور شہید اعظم حضرت امام حسینؑ کی مدّاحی میں زندگی صرف کی، مرثیے لکھے، خود خوب روئے، دوسروں کو خوب رُلایا مگر یہ عجیب بات ہے کہ جس باکمال شاعر کی طبیعت اس قدر لااوبالی ہو جس کے پہلو میں عاشقوں کا دل ہو، جس کے مزاج میں رندوں کی آوارگی ہو، جس کا ایک ایک شعر زندگی کے طربیہ پہلو کا غماز ہو، جس کے نغموں کی نشاط آرائیاں آج بھی ہمیں وجد میں لاتی ہوں، وہ جب رونے پر آتا ہے تو کائنات کے ذرّے ذرّے کو غم و الم کی تصویر بھی بنا دیتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آغا شاعر کی تمثیل نگاری یا ڈرامہ نویسی کی ابتدا کیسے ہوئی ہے۔ بالعموم یہ تمثیل نگار پہلے خود اداکار ہوتے ہیں، اور بعد تمثیل نگار سمجھے جاتے ہیں، یورپ کا تمثیل نگار شکسپیر بھی اوّل اوّل اسٹیج کا ایک فرد تھا، اور کتنے ہی دوسرے تمثیل نگار، ہر ملک میں ایسے ملیں گے، جن کی فنکاری ابتدا میں اداکاری کی مرہونِ منت رہی ہے، آج بھی ہمارے ملک کے اکثر سینما ڈرامہ نسٹ ایسے ہیں جنہوں نے پہلے اسکرین پر کام کیا ہے پرتھوی راج اور راج کپور اس کی تازہ ترین اور روشن ترین مثالیں ہیں ممکن ہے جوانی میں آغا شاعر کو بھی اسٹیج پر آنے کا موقعہ ملا ہو۔ کیونکہ جن حضرات نے آغا شاعر کے اطوار و کردار مطالعہ کیا ہے وہ اُن کے لب و لہجے اور اُن کے طریقِ عمل میں ایک اداکارانہ انداز پاتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرثیہ خوانی میں جذبات کی عکاسی کے لئے جسمانی

اشاروں اور حرکتوں سے کام لینے کے باعث ان کے عام کردار و گفتار اداکارانہ ذہنیت پر بھی اثر پڑا ہو، لیکن مجھے ذاتی طور پر کبھی کبھی یہ ضرور محسوس ہوا کہ آغا میں دانستہ یا نادانستہ طور پر اداکارانہ انداز موجود تھا۔

آغا کی طبیعت رمیق ہونے کے باوجود غیور بھی تھی، اُن کی رقیق القلبی کے افسانے میرے سننے میں آئے ہیں، مجھے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اکثر اپنے سامنے رکھے ہوئے دسترخوان کو حاجت مندوں اور بھوکی پیاسی روحوں کی آسودگی کے لئے وقف کر دیا ہے، اور خود خلیل اللہ کی طرح فاقہ کشی میں دن گذار دیا ہے میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب کسی دولت مند قدردان کی طرف سے آغا کو تھیلی پیش کی گئی تو وہ گھر آنے سے پہلے ہی ضرورت مند دوستوں اور دوسرے مصاحبوں کے کام آگئی۔ ایک شاعر کامل پھر رند مزاج طبیعت فقیری میں بھی بادشاہی نہ کرتی تو کیا کرتی۔

ہاں تو اس وقت تک میں نے آغا کی غزلوں کا سیر حاصل مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اربابِ نشاط میں ان کی غزلیں اکثر گائی جاتی تھیں اور بہت مقبول تھیں لیکن جب میں نے آغا شاعر کے فرزند ارجمند آغا سرخوش کے رسالہ چمنستان میں پہلی مرتبہ ان کی غزلوں کے کثیر التعداد نمونے دیکھے تو میں ان کی غزل گوئی کا پہلے سے زیادہ قائل ہو گیا، اور داغ کے تمام برگزیدہ تلامذہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ داغ کے برگزیدہ تلامذہ میں سبھی اپنی اپنی جگہ ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں، لیکن آغا شاعر کی حیثیت اُن سب سے جداگانہ ہے داغ کے تلامذہ میں جتنا زیادہ متاثر میں ثاقب بدایونی اور آغا شاعر کے کلام سے

ہوا، اتنا اوروں کے کلام سے نہیں ہوا، یہ اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے مذاق کا سوال ہے، اس سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ داغ کے دوسرے باکمال تلامذہ کے ساتھ بے انصافی کرکے میں ان کو اور ان کے مدّاحوں کو کسی قسم کا صدمہ پہنچاؤں، ثاقب بدایونی کی دنیائے تغزّل اپنے عہد کی ترجمانی کر رہی تھی، مگر آغا شاعر اپنے عہد سے ذرا آگے بڑھ کر دنیائے شاعری میں قدم رکھ رہے تھے، دہلی میں وہ اپنی انفرادیت کے اظہار سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے اور بیشتر یہی وجہ تھی اُن کے مشاعروں سے دور رہنے کی، وہ زمانہ میں نے دیکھا جب آغا شاعر دہلی کے مشاعروں میں جانا اپنی ہتک سمجھنے لگے تھے۔ بظاہر حضرت سائل اور حضرت بیخود کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے تھے۔ لیکن وہ ان دونوں کے بمقابلے خود کو افضل و برتر سمجھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی ان تمام بزرگوں میں باہمی چشمک کی،

لیکن اب نہ آغا شاعر ہیں نہ سائل، بیخود صاحب بھی چراغِ سحری ہیں لہٰذا ان تینوں باکمالوں کی معاصرانہ چشمک کا ذکر کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر جس طرح میر و سودا، انشاء مصحفی، آتش و ناسخ، انیس و دبیر کی فنکارانہ نوک جھونک ہماری ادبی تاریخ کا دلچسپ اور ناقابلِ فراموش باب ہے، اسی طرح ہم آغا شاعر، سائل، اور بیخود کی باہمی چشمکوں کے ذکر کو تاریخی دلچسپی کا باعث سمجھتے ہیں، یہ چشمکیں جائز حدوں کے اندر رہ کر بہت حسین ہوتی ہیں اور بعض مرتبہ ان چشمکوں پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔

یُوں تو آغا شاعر کا سارا کلام اُن کو اُس وقت تک زندہ رکھے گا

جب تک اُردو زبان صفحۂ ہستی پر قائم ہے۔ لیکن حسنِ عقیدت تو مجھے یہ بھی کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ آغا شاعر کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے اُن کا یہی ایک شعر کافی ہے،

جو برق و باد پہ قادر، وہ اِس قدر مجبُور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اِختیار نہیں

(منقول از شعلۂ و شبنم شاعر نمبر ۱۹۵۳ء)

افسر الشعرا آغا شاعر دہلوی

نادم سیتاپوری

بات کچھ زیادہ دنوں کی نہیں ہے، حال ہی کا ذکر ہے کہ دلّی میں اُستادوں کی "تین چوکیاں" دنیائے شعر و سخن کی جان سمجھی جاتی تھیں، اور فصیح الملک داغ دہلوی کے یہ تینوں شاگرد سائل، بیخود اور آغا شاعر ایک خصوصیت رکھتے تھے کہ تینوں دہلی کے رہنے والے تھے اور دہلی اسکول کے صحیح ترجمان اور نمائندے سمجھے جاتے تھے۔

آغا شاعر ۵ مارچ ۱۸۷۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء میں اسی دلّی کی خاک کا پیوند ہو گئے، جس نے تمام عمر انہیں در بدر خاک چھنوائی، غربت کی ٹھوکریں کھلوائیں اور دو دن بھی اپنے اس چہیتے فرزند کو سینے سے لگائے رکھنا قبول نہ کیا، بارہ برس کی کچی عمر میں گھر سے نکال دیئے گئے، دو دن بے آب و دانہ پھرتے رہے۔ آخر جھلسا دینے والی دھوپ اور تپش سے نڈھال ہو کر شاہ کلیم اللہ کے تکیے میں جا بیٹھے، جہاں اُس وقت اُن کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔

آغا شاعر کو افسر الشعراء آغا شاعر دہلوی سمجھنے والے تو اب بھی بہت ہیں، اور کچھ ایسے لوگ بھی ابھی زندہ ہیں جنہوں نے اُن کو "دلدار شاہ داتا" کے روپ میں "گیروے کپڑے" پہنے ہوئے دیکھا تھا، لیکن یہ جاننے والے شاید کم ہی ہوں گے کہ دلّی کے مشہور خاندانِ اہلِ سیف کا "ظفر علی بیگ" یہی "آغا شاعر قزلباش تھا

جس کے آباء و اجداد کا شمار کبھی دلّی کے عمائدین میں کیا جاتا تھا، قدیم دلّی میں اِس خاندان کی آن بان کبھی ضرب المثل تھی، اور یہ خاندان اپنے زمانے میں دلّی کے روایتی "بھولے پن" کا جیتا جاگتا نمونہ سمجھا جاتا تھا، خود آغا صاحب نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ دیس پردیس "عالمِ غربت" میں گذارا، لیکن اُنہیں دلّی سے جو والہانہ عشق اور دیوانہ وار محبت تھی اس کی معمولی مثال ملّا واحدی دہلوی کے اِن الفاظ میں اچھی طرح نظر آتی ہے :-

"آغا شاعر کی میرے نزدیک تین خصوصیتیں تھیں، ایک نظم و نثر دونوں پر قابو، دوسرے دلّی کی محبت، تیسرے زندہ دلی اور رنگین مزاجی، دلّی کی محبت آغا شاعر کے دل میں کتنی ہے، ذرا سی کوئی بات شیخ صاحب (سر عبد القادر ایڈیٹر مخزن لاہور) کے کسی مہمان کی زبان سے بھی ایسی نکل گئی، جس سے دلّی کی سُبکی ہوتی ہے تو بس آغا صاحب بگڑ گئے، اور اب سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ خود شیخ صاحب نے کہیں کسی محاورے پر اصرار کیا کہ یہ یوں ہے، اور آغا صاحب کو غصّہ آیا، تم کیا جانو؟ میں نے اپنی ماں کو اسی طرح بولتے سُنا، اپنے باپ کی زبان پر یہی الفاظ پائے۔

سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں نے کم عمری میں آغا صاحب کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ جانکاہ حادثہ ایسا تھا جس کے اثرات نے تمام عمر آغا صاحب کو چین نہ لینے دیا، گویا یہی المیہ اس بدنصیبی کا آغاز یہ تھا جو غریب الوطنی بن کر اُن کے سر پر زندگی بھر منڈلاتا گیا، خوددار، غیور اور حساس ایسے تھے کہ جس دن سے گھر چھوڑا، پھر کبھی اُسے اپنا گھر سمجھ کر اس گھر میں قدم نہ رکھا، بدبختی ایسے ماحول میں

لے گئی تھی جہاں کسی تعلیم و تربیت کا سوال ہی کیا؟ گیر وے کپڑے زیب تن کئے "الّا اللہ" کا نعرہ لگایا اور "دلدار شاہ داتا" بن بیٹھے، باوجود اختلافِ مسلک کے "اربابِ طریقت" کی مجلسوں میں جا پہنچے اور فقرا، و مشائخ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ خود اُن کے بارے میں کراماتی تذکرے شہرت پا گئے۔ طالب دہلوی نے آغا صاحب کے آغازِ معرفت کا ایک دلچسپ واقعہ تحریر فرمایا ہے:۔

"سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آ کر بارہ برس کی عمر میں گھر چھوڑا، وہ دو دن کے مسلسل فاقے سے تھے، جب آپ حضرت شاہ کلیم اللہ کے مزار پر جا بیٹھے، دور دور آدمی کا پتہ نہ تھا، سخت گرمی پڑ رہی تھی، اس بچے نے فاقے اور خستگی سے چور ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا، مزار پر لیٹے ہی تھے کہ نیند آ گئی، تھوڑی دیر میں کھانے کی خوشبو سے آنکھ کھلی، دیکھا تو زردے سے بھری ہوئی چوٹی دار پلیٹ سامنے موجود ہے، وہ کھائی اور پانی پیا، اس کے کھاتے ہی ایک قسم کا سرور پیدا ہوا جو شعر کہنے سے پہلے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اور پہلا شعر اس وقت زبان سے نکلا جب ہرگز ہرگز سنِ تمیز و شعور نے آپ کو نہ چھوا تھا۔"

واقعہ خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس حادثے نے آغا صاحب کی نشو و نما میں حسرت ناک رکاوٹ پیدا کر دی اور وہ شایانِ شان تعلیم و تربیت سے محروم ہو گئے، انہوں نے ان ناسازگار حالت میں جو کچھ بھی حاصل کیا وہ ان ہی کا حصہ تھا۔

آغا صاحب نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو لُٹی ہوئی دلّی بھی چراغِ سحر کی طرح جھلملا رہی تھی، آزاد، حالی، نذیر احمد، ظہیر اور داغ دہلوی بھی گردشِ زمانہ

کے ہاتھوں سے دلّی چھوڑ چکے تھے، ان کے جی میں بھی یہی سمائی کہ جس سرزمین نے ان باکمالوں کا ساتھ نہ دیا، وہ اپنا ساتھ کیا دے گی، چنانچہ دلّی چھوڑی اور وہ بھی اس طرح کہ آج لاہور میں ہیں، تو کل بھوپال میں، کل حیدرآباد میں ہیں تو پرسوں لکھنؤ میں، شومئی قسمت ہر جگہ ساتھ تھی کہیں دو دن چین سے نہ رہ سکے

اس صدی کی دوسری دہائی میں آغا صاحب کی دوسری شادی سیتاپور کے ایک ممتاز خاندان میں ہوئی، ان کے خسر سید امیر حیدر کا شمار عمائدین سیتاپور میں تھا، سید صاحب کے دادا میر محمد آصف مشہدی سیتاپوری اپنے عہد کے ایک خوش گو شاعر تھے، "صاحبِ تذکرہ صبح گلشن" تحریر فرماتے ہیں :-

"مشہدی۔ سید محمد آصف از شہر سیتاپور در متصل خیرآباد از عمالِ صوبہ اودھ سرکشیدہ اسلافش از شہر آمدہ بر آں مشہدی تخلص گردیدہ

گر نہی پا بسر خاکِ من خون آلود
آئیم از خاک بروں با کفن خوں آلود

صفحہ ۴۱۹۔ صبح گلشن مطبوعہ شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۵ھ

مشہدی فارسی کے ایک خوش گو شاعر ہی نہ تھے، بلکہ عربی و فارسی کے عالمِ متبحر بھی تھے، ان کی سب سے بڑی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ انہوں نے جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو فارسی اور اردو علوم کی ابتدائی تعلیم دی تھی، عرصے تک ریاست "بھٹور" میں مقیم رہے، جھانسی کے زوال ۱۸۵۷ء سے کچھ ہی پہلے "بھٹور" سے کان پور آ گئے تھے، جہاں ان کے صاحبزادے ناظر عاشق علی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی ملازمت سے وابستہ تھے۔

اس قرابت داری کے بعد آغا صاحب کی آمد و رفت سیتا پور ہونے لگی۔ اور جب کبھی وہ سیتا پور آجاتے تو اچھی خاصی چہل پہل ہو جاتی۔

آغا صاحب بہت ہی نیک نفس، فیاض طینت، سادہ مزاج، خلیق اور ملنسار قسم کے انسان تھے، لیکن غیور اور خوددار ایسے کہ کبھی مصائب و آلام کے سخت سے سخت دور میں اپنے عزیزوں کی مدد نہیں چاہی یہانتک کہ سیتا پور کی سسرالی جائداد کی طرف کبھی نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔

سیتا پور کے زمانۂ قیام میں اکثر لکھنؤ اور دہلی کی ادبی بحثیں بڑی گرما گرمی سے چھڑ جایا کرتی تھیں اور اُن کے بعض سسرالی اعزہ محض انہیں چھیڑنے کے لئے دہلی کی زبان اور محاورات کا تمسخر بھی اُڑایا کرتے تھے، جس کا جواب آغا صاحب کی طرف سے ہمیشہ اسی روایتی سنجیدگی کے ساتھ ملتا جو اُن کے مسکراتے ہوئے چہرے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی، لیکن جب کبھی یہ مذاق اُن کے اُستاد داغ تک پہنچ جاتا تو یہ اپنے آپے سے باہر ہو جاتے۔ پھر بھی اُستادانہ انصاف پسندی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔

آغا شاعر کی ادبی زندگی کا آغاز تو ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ بحیثیت ایک صحافی اور ادیب کے وہ زیادہ کامیاب رہے آغا صاحب کے ہم عصر (مولانا ظفر علی خاں اور ریاض خیر آبادی) بھی نظم کی طرح نثر پر قدرت رکھتے تھے، صحافی بھی تھے اور اچھے ادیب بھی)، ان تینوں کی زندگی کئی زاویوں سے بہت کچھ مماثلت و مشابہت رکھتی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ آغا صاحب کچھ ضرورت سے زیادہ صاف باطن اور نیک دل انسان تھے

اور اپنی زندگی میں کبھی کوئی پارٹی قائم نہ کر سکے۔ چنانچہ آج ان کے بعد ہندستان اور پاکستان میں کوئی ایسا حلقہ نظر نہیں آتا جو اُن کے علمی، ادبی اور صحافتی کارناموں کی یاد تازہ رکھ سکے۔

آغا صاحب کی منظوم تخلیقات میں سب سے زیادہ مقبولیت "خمکدۂ خیام" نے حاصل کی، جو عمر خیام کی رباعیات کا ایسا منظوم ترجمہ ہے جس کا نقشِ ثانی ابھی تک اردو ادب کو حاصل نہ ہو سکا، کلام پاک کا منظوم ترجمہ اپنے رنگ کی غالباً پہلی چیز ہے جو شائع نہ ہو سکا ورنہ شاید اُن کا سب سے بڑا تاریخی کارنامہ قرار دیا جاتا، ان کی شعری زندگی دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ ایک تو ابتدائی دور سنہ ۱۹۰۱ء تک دوسرا دور سنہ ۱۹۳۵ء پر ختم ہوتا ہے پہلا دیوان "تیر و نشتر" سنہ ۱۹۰۱ء میں مخزن پریس لاہور نے شائع کیا تھا، اس صدی کے آغاز میں داغ کی وفات کے بعد آغا صاحب کے شعری فن نے سارے ہندستان میں دھوم مچا رکھی تھی

آغا صاحب کی جو تصانیف و تالیفات فراہم ہو سکی ہیں۔ اس فہرست کو نامکمل ہی سمجھنا چاہیئے۔ اگر کوشش کی جائے تو میرا خیال ہے کہ ان کے علاوہ ابھی اور بہت کچھ دستیاب ہو سکتا ہے، مطبوعات کی مندرجہ ذیل فہرست نامکمل ہی نہیں غیر مسلسل بھی ہے۔

۱۔ تیر و نشتر (دیوان) شائع کردہ مخزن پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۰۱ء

۲۔ منظوم ترجمہ کلام مجید۔ ۳ پارے شائع ہوئے باقی غیر مطبوعہ

۳۔ خمکدۂ خیام۔ (رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ)

۴ - گلگونۂ شہادت (واقعۂ کربلا پر ایک نثری تالیف مطبوعہ یوسفی پریس دہلی ۱۹۱۵ء -

۵ - ہمارا آسمان - شائع کردہ فیروز سنز لاہور

۶ - خمارستان (مجموعۂ نثر) شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس دلی -

۷ - بلبلانِ فارس (ایرانی شعراء کے کلام کا ترجمہ و حالات) شائع کردہ فیروز سنز -

۸ - لیلیٰٔ دمشق - (ناول) شائع کردہ آزاد بک ڈپو لاہور

۹ - ارمان - (ناول)

۱۰ - انور و رضیہ - (ناول) شائع کردہ مطبع خادم الاسلام دہلی

۱۱ - آویزۂ گوش (خواتین کے لئے)

۱۲ - شعلۂ جوالہ (ناولٹ)

۱۳ - قتلِ نظیر - (ڈرامہ)

۱۴ - حورِ جنت - (ڈرامہ)

۱۵ - روحِ نغمہ - غزلیات - راگ راگنیوں اور دھنوں کے ساتھ -

غیر مطبوعہ ہی ہیں - ان پندرہ کتابوں کے علاوہ آغا صاحب کی مطبوعہ کتابیں اور بھی ہوں گی جو مجھے دستیاب نہ ہو سکیں -

ڈرامہ آغا صاحب کا اتنا کامیاب موضوع تھا کہ اگر وہ اس ماحول کو برداشت کر سکتے تو اُن کے شاگردِ رشید آغا حشر کاشمیری کا نام یقیناً اردو ڈرامے میں آغا شاعر کے بعد ہی لیا جاتا، لیکن اب سے نصف صدی پہلے

اسٹیل ڈراموں کا تعلق ایک ایسے ماحول سے تھا جسے اپنا لینا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی، چنانچہ آغا صاحب بہت ہی جلد اس فضا سے اُکتا گئے اور اُن کی ڈرامہ نگاری کا دور صرف چند ڈراموں پر جا کر ختم ہو گیا۔

طالب دہلوی نے آغا صاحب کی ڈرامہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "ڈرامہ نویسی میں وہ کمال پیدا کیا کہ انڈین شکسپیئر محمد شاہ حشر کاشمیری نے نہ صرف آپ سے استفادہ کیا، بلکہ (آغا صاحب سے) نسبت قائم کرنے کے لئے خود بھی آغا حشر کاشمیری کہلائے۔ شاعر کے ڈراموں میں عوام کا مذاق بدل جانے کے باوجود "قتل نظیر" آج تک مقبول عام ہے (صفحہ ۸۰ شعلہ و شبنم آغا شاعر)

آغا صاحب مدتوں "وکیل امرتسر" وطن لاہور اور دوسرے اخباروں میں ادارتی فرائض انجام دیتے رہے، لیکن ان کی باقاعدہ ادبی صحافت کا آغاز ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں اس وقت ہوا جب کہ وہ جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) کے دربار سے وابستہ ہوئے ماہنامہ آفتاب کا اجرا یہیں سے ہوا

آغا شاعر کا آرٹ اور فن اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے کہ اس کے ہر شعبہ کا تنقیدی جائزہ علیحدہ علیحدہ لیا جائے، ان کا شعری فن، صحافتی شعور، اور تمثیل نگاری کی خداداد صلاحیتیں ایسی نہیں ہیں جنہیں اس طرح نظر انداز کر دیا جائے کہ چند روز میں اردو ادب کی تاریخ میں آغا شاعر کا نام بھی کہیں نظر نہ آئے۔

(منقول از الشجاع ۹ مارچ سنہ ۱۹۶۳ء)

آغا شاعر بحیثیت صحافی

ماہنامہ "آفتاب" ریاض خیرآبادی ظفر علی خاں اور حسرت موہانی کی طرح

آغا شاعر دہلوی کے بارے میں بھی یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا کہ بحیثیت شاعروں کی اہمیت زیادہ ہے یا بحیثیت ادیب، نثار یا صحافی! ریاض کی خمریات نے "ریاض الاخبار، نار برقی جسلح گل، فتنہ، اور عطر فتنہ" سے زیادہ مقبولیت حاصل کی، حسرت کے "اردوئے معلی" کا ذکر بھی اب کم ہی سننے میں آتا ہے۔ غزل کے جدید تنقیدی ادب ضرور کبھی کبھی حسرت کی خداداد شعری صلاحیتوں کی داد دیتے ہیں، حالانکہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ بہت سی کروٹیں بدلنے کے باوجود ان کی بیش قیمت قربانیوں کے اذکار سے ابھی تک خالی نظر نہیں آتی۔ کم و بیش یہی حال ظفر علی خاں کا ہے جو اپنے دور کے مشہور ترجمہ نگار ہی نہیں بلکہ "بے تخلص" شعراء کی صف اول میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے صحافت انہیں ورثے میں ملی تھی، "زمیندار، دکن ریویو، افسانہ، پنجاب ریویو اور پھر ستارہ صبح" نے تو ایک زمانے میں ایسی دھوم مچائی کہ اقبال کی مثنویاں ایک اچھے خاصے ادبی معرکے کی زد میں آگئیں، لیکن سیاست ان کا مقدر ہو چکی تھی، اثیر پنجاب پر خاتمہ ہوا ان کا۔

افسر الشعرا آغا ظفر علی قزلباش شاعر دہلوی (سنہ ۱۸۷۱ء۔ سنہ ۱۹۴۰ء) کی ادبی زندگی جس مدو جذر کا شکار رہی اُسے آج بھی ایک مرکز پر قرار نہیں، رباعیات عمر خیام کا اردو ترجمہ تو خیر ان کا شاہکار ہی سمجھا جاتا ہے! اسکے علاوہ ان کے ڈرامے، اور ناول بھی اپنے زمانے میں کچھ کم مقبول نہیں ہوئے!

البتہ آصف الاخبار، وطن، محسن اردو، نیرنگ نگارین، اور ماہنامہ آفتاب جنہیں آغا شاعر کی صحافتی زندگی کا ماحصل کہنا چاہیئے۔ اس طرح ہمارے ذہن و شعور سے محو ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ چند روز میں ان کے دھندلکوں کا تصور بھی باقی نہ رہے گا، وطن، آصف الاخبار، نیرنگ نگارین کی فائلوں کا تو ذکر کیا؟ اب ایک شمارہ بھی ہمیں نظر نہیں آتا، یہی حال آفتاب کے پہلے دور کا ہے شاید اس کے آخری دور کے کچھ پرچے کہیں محفوظ ہوں۔ لیکن مجھے اب تک فراہم نہ ہو سکے، مجھے آفتاب کے دوسرے دور کی ایک نامکمل جلد مدرسۃ الواعظین لکھنو کے کتب خانے سے دستیاب ہوئی اور یہی اس مضمون کا سرچشمہ ہے

آغا شاعر دہلوی سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں کا شکار ہو کر کم عمری میں اس طرح گھر سے نکلے کہ پھر تمام عمر اس گھر میں واپس نہ گئے، دلّی چھوٹی، لاہور پہنچے اور پھر حیدر آباد دکن، بھوپال، لکھنو اور متعدد دیسی ریاستوں میں قسمت آزمائی کرتے رہے! مدتوں خواجہ حسن نظامی مولانا ابوالکلام آزاد، سر عبدالقادر اور راشد الخیری وغیرہ کے ساتھ کام کرتے رہے، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کے دربار تک رسائی ہوئی، لیکن وہاں بھی نہ جمے، آخر ۱۹۲۰ء سے کچھ پہلے راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست جھالرا پاٹن نے قدر افزائی کی، درباری شاعر کی حیثیت سے معزز کئے گئے، مگر چند ہی روز میں "سر مہاراج" کی علم دوستی اور معارف پروری نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انہیں اپنے فطری ذوق کی تکمیل کا ایک بار پھر موقع ملا اور ماہنامہ آفتاب کے دوسرے دور کا آغاز مارچ ۱۹۲۰ء سے ہوا۔

ماہنامہ "آفتاب" خود آغا شاعر کی ملکیت تھا، جسے انہوں نے اپنے بڑے بیٹے "آغا آفتاب علی قزلباش" کے نام پر نکالا تھا، لیکن جب یہ اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہوا تو جھالرا پاٹن کے مہاراجہ ہز ہائی نس سر بھوانی سنگھ کو ایسی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ وہی سب کچھ نظر آنے لگے "آفتاب" کے سرورق پر مہاراجہ کا نام بحیثیت سرپرست چھپتا تھا اور "آفتاب" کا دفتر جھالرا پاٹن کے "قلعہ" میں قائم تھا، ریاست کے سنٹرل جیل پریس کے سپرد اس کی چھپائی وغیرہ کا انتظام تھا، مہاراجہ کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے بہت سے فرمانروا اس کے مربی اور سرپرست ہو گئے تھے جن میں نظام دکن، مہاراجہ کشمیر، مہاراجہ بیکانیر، نواب بیگم بھوپال، مہاراجہ راج گڑھ، نواب ٹونک، مہاراجہ بھلی پور، نواب جنجیرہ اور مہاراجہ کلیہ کے علاوہ دوسرے امراء اور جاگیردار بھی شامل تھے یہی نہیں بلکہ آفتاب کا حلقہ اشاعت ہندوستان کے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک منظوم اعلان میں ان ممالک کے نام گنائے گئے ہیں جہاں یہ پرچہ جاتا تھا۔

چین - افریقہ اور جاکوبہ ⁂ تھوڑی سی عمر میں یہ جا پہنچا
چشم بد دور دن بدن ہے بلند ⁂ اپنا رکھتا نہیں ہے یہ مانند
خبر سے ایسٹ پرشیا اس کا ⁂ امرکہ، مارسایز اور جاوا

(جولائی ۱۹۲۰ء)

محض "دامے درمے" ہی نہیں! بلکہ مہاراجہ کو "آفتاب" سے قلمے سخنے،

بھی کافی دلچسپی تھی، اس دوسرے دَور کے جتنے پرچے میرے سامنے ہیں اُن سب میں مہاراجہ کے مسلسل مضامین بالاقساط چھپے ہیں، مہاراجہ کے یہ مضامین اردو نثاری کے کامیاب نمونے نہیں ہیں بلکہ معلوماتی حیثیت سے انہیں اردو ادب میں ایک خاص جگہ حاصل ہے، یہ معلومات زیادہ تر سائنس کے اُن زاویوں سے تعلق رکھتے ہیں جو پہلی جنگِ عظیم تک انسانی ذہن و شعور کو منور و تابندہ بھی کرتے تھے۔

جس زمانے میں آفتاب اپنی زندگی کے دوسرے دَور میں داخل ہوا تھا اس وقت تک اردو زبان کے ادیب مختلف حلقوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے گنے چُنے لکھنے والے تھے جن کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ہر رسالہ اور اخبار کوشاں رہتا تھا، آغا شاعر اپنی ہندستان گیر شہرت کے لحاظ سے اس حلقے سے کافی قریب تھے، چنانچہ آفتاب کے لکھنے والوں میں اس عہد کا شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہو جو شامل نہ ہو، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، آغا حیدر حسن دہلوی، علامہ کیفی، علامہ نظم طباطبائی، احسان اللہ خاں گورکھپوری، ڈاکٹر اقبال، اکبر الہ آبادی، ریاض خیرآبادی۔ مہاراجہ کشن پرشاد، رضا علی وحشت۔ قاضی محمد محسن وفا سیتاپوری، عزیز لکھنوی اسمٰعیل میرٹھی، مہاراج بہادر برق دہلوی، پیارے لال رونق دہلوی وغیرہ۔

صحافتی ترتیب کے اعتبار سے آفتاب بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح حصۂ نثر اور حصۂ نظم میں تقسیم تھا۔ ہر شمارے میں تین عنوان مستقل تھے، پہلی کرن، جسے "افتتاحیہ" کہنا چاہیئے "نصف النہار" جس میں دوسروں

کے مضامین، تیسرا "دھوپ چھاؤں" حصۂ نظم میں عام طور سے غزلیں، نظمیں، یا ایسی ہی شعری تخلیقات! آخری چند صفحات معمولی کاغذ پر ہوتے تھے جن میں رسالے کے اغراض و مقاصد اور اسی قسم کی بعض چیزوں کے علاوہ اشتہارات شائع کئے جاتے تھے، رسالے کی ضخامت عام طور سے ۳۲ بتیس صفحات ہوتی تھی، سرورق اور معمولی صفحات کے علاوہ!۔

اس دوسرے دور (سنہ ۱۹۲۰ء) کے جو دس شمارے میرے پیش نظر ہیں ان میں مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کا شمارہ پہلا پرچہ ہے جس پر جلد ۴ شمارہ ۱۶ پڑا ہوا ہے اس نمبر میں ایک خاص مضمون "توپ" مہاراجہ جھالرا پاٹن کا ہے۔ دوسرا خواجہ حسن نظامی کا، نظم کے حصے میں مہاراجہ کشن پرشاد، اکبر الہ آبادی، پروفیسر مہدی حسن ناصری اور مرزا عاشق حسین بزم اکبرآبادی وغیرہ کی غزلیں ہیں۔

اپریل سنہ ۱۹۲۰ء سے اس کی دوسری جلد بدل گئی لیکن اس جلد ۵ پر شمارہ نمبر ۱ کی بجائے "چار" پڑا ہوا ہے، جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس مہینے کے مضامین میں سب سے اہم مضمون "اردو کی انشا دورِ جدید میں"، علامہ کیفی دہلوی نے ان رجحانات کی مخالفت کی ہے جو اردو زبان میں "وضع اصلاحات" کی تحریک کے تحت غیر مانوس الفاظ کو شامل کرنے کے موید تھے، علامہ کیفی کا نظریہ یہ تھا کہ اردو زبان میں جو الفاظ جس طرح بر زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں انہیں بدستور اپنی جگہ پر قائم و برقرار رکھا جائے، خواہ وہ عربی سے لیے گئے ہوں یا سنسکرت، فارسی یا اور کسی زبان سے، اس سلسلے میں علامہ کیفی نے حیدرآباد دکن کی "تحریک وضع اصلاحات" کو اردو زبان کی ترقی میں

ایک طرح سے رکاوٹ قرار دیا ہے، علامہ کیفی تحریر فرماتے ہیں :-

"ابھی تھوڑا عرصہ ہوا عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی ترتیب وتدوین کی ذیل میں اصطلاحاتِ علوم طبعیات کے متعلق حیدرآباد دکن میں بڑی بحث ہوئی، ایک فریق کے وکیل مولانا علی حیدر نظم، طباطبائی حیدر یار جنگ تھے۔ آپ باوجودیکہ عربی فارسی کے جید عالم ہیں، لیکن آپ کا قول یہ تھا کہ اگر ایک لفظ انگریزی کا ایک چیز کے لئے مقرر ہے تو اسی کو اردو میں استعمال کرنا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ عربی کا ایک سطر کا فقرہ گھڑا جائے ہندی والوں نے بڑی عقلمندی کی، پنڈتوں کی ایک نہ مانی اور بہت سی اصلاحی لغت یا ترکیبیں جن کی آواز کانوں کو ناگوار تھی اور جن کا قائم مقام غیر مانوس سنسکرت لغت یا فقرہ تھا جوں کے توں اپنی علمی فرہنگ میں داخل کر لیے "

(بحوالہ ہندی سائنٹفک گلاسری مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس)

" علامہ کیفی کا یہ مضمون اب سے چالیس برس ادھر کے متحدانہ لسانی نظریات کا ترجمان ہے ۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان کی الجھی ہوئی لسانی گتھی سلجھانے کے لئے اگرچہ آج بھی باتیں اسی قسم کی کی جاتی ہیں مگر عمل اس کے برعکس! آج گاندھی جی کے لسانی نظریات کی کوئی اہمیت ہے نہ خود ناگری پرچارنی سبھا اپنی نظریات کی پابند! آزادی کے بعد تو ہندستان میں جو زبان جنم دی جا رہی ہے اسے خود وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو بزعم خود اس کے "خالق" ہیں۔

علامہ کیفی کے اس مضمون کے علاوہ مہاراجہ کے اسی مضمون "توپ"

کی بقیہ قسط اور ایرانی سفیر نواب نصیر الممالک کے سفرنامہ اٹلی کی ایک قسط بھی ہے، حصہ نظم میں اکبر الٰہ آبادی کے ۲ دو قطعے، ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم "آفتاب حقیقت" جو رگ وید کی مشہور دعا "گایتری" کا ترجمہ ہے اس اردو نظم میں ۱۰ دس شعر ہیں، ان کے علاوہ "حضرت دل" قاضی محمد محسن وفا سیتاپوری کی ایک نظم اور قلق سندیلوی کی ایک خاص فارسی نظم بھی ہے

مئی ۱۹۲۰ء کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے :-

۱ - پہلی کرن - یاد وطن - آغا شاعر (ایڈیٹر)

۲ - دربار ہولی - "

۳ - نصف النہار (اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے) راشد الخیری دہلوی

۴ - دیس اچھا پردیس - سید سجاد حیدر یلدرم

۵ - گوشہ کلاہ دہقان بر آفتاب رسید - آغا شاعر

۶ - "توپ" - مہاراجہ جھالاواڑ

۷ - دھوپ چھاؤں - ۲ دو خط - نذیر احمد خاں بی، ایس، سی

۸ - سکۂ زر - آغا شاعر دہلوی

حصۂ نظم میں اکبر الٰہ آبادی کی نظم "مغربی پھول" کے ۱۰ دس اشعار، اور دوسرا قطعہ ڈاکٹر اقبال کا ہے، جو "علی برادراں" کی رہائی پر کہا گیا تھا۔ اس قطعہ میں صرف ۴ شعر ہیں :-

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے؟ اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

غزلوں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد، جلیل، ریاض، نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں دہلوی، اور خود آغا شاعر کی غزل شامل ہے۔ فصاحت یار جنگ جلیل کو "مانک پوری" کے بجائے لکھنوی اور ریاض خیر آبادی کو "گورکھپوری" لکھا گیا ہے۔

آغا شاعر کا مضمون "یادِ وطن" دلّی کی بامحاورہ اردو کا ایک مثالی نمونہ ہے

جون ۱۹۲۰ء کے شمارے میں نظم طباطبائی سید سجاد حیدر یلدرم احسان اللہ خاں گورکھپوری اور خود آغا شاعر کے تین مضامین شامل ہیں۔ آغا شاعر کا مضمون "مغربی روشنی میں اردو کا دورِ جدید" اردو ادب کی تاریخ کا ایک کامیاب تجربہ ہے۔ اس مضمون کے چند سرسری خاکے ملاحظہ ہوں۔

"یہی وقت تھا جب علی گڑھ میں سر سید احمد خان جیسا کوہ شکن انجینئر جہاں مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے مانوس کرنا چاہتا تھا، وہیں وہ اردو کی نئی داغ بیل بھی ڈال رہا تھا۔ بیل اور سرچشمے قائم ہو رہے تھے۔ نواب محسن الملک، سعدیٔ اردو مولوی الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد خاں ایل ایل ڈی اور مولوی ذکاء اللہ خاں جیسے مورخ و سخن طراز ان کے ہم بزم و ہم خیال تھے، چنانچہ "تہذیب الاخلاق" کے صفحے رنگے جانے لگے

اور ان بزرگوں کی گراں مایہ اور عدیم المثال تصانیف سے اردو کا خزانہ مالا مال ہو گیا۔

نظم کا میدان اس زمانہ میں جہاں استاد بلبل ہندستان نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی، منشی امیر احمد صاحب مینائی، حکیم سید ضامن علی صاحب جلیل لکھنوی، حکیم ظہیر و مجروح، منشی امیر اللہ تسلیم، اور شہزادہ ارشد گورگانی تک وسیع ہو گیا تھا۔ مذہبی واقعہ نگاروں میں میر انیس اعلے اللہ مقامہ۔ جناب مرزا اوج   اور جناب رشید مرحوم یادگار ناظم مانے گئے"۔

"زندہ دلان پنجاب" کے تحت اسی مضمون میں پنجاب کی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے:۔ "یہ لوگ مغربی علوم کی جھلکیاں دیکھ ہی چکے تھے۔ اب مشرقی رنگ کو بھی سمو لیا اور دو آتشہ رام رنگی کے دور پر دور چلنے لگے، ہاں البتہ اگر ان میں کچھ کور کسر تھی تو صرف اتنی ہی کہ اردو کے بیشتر محاورات سے ناواقفیت، موقع اور محل سے نابلد، تذکیر و تانیث سے اجنبی، اوچھی پونجی اور شوق زیادہ، مگر ہمت کا قدم آگے تھا، اس لئے کسی کی پرواہ نہ کی شارٹ ورڈیڈ SHORTWORDED ہونا قبول کیا، مگر کام کرنے پر تل گئے۔ رفتہ رفتہ درس و تدریس سے افہام و تفہیم کی منزلیں طے کرتے ہوئے اخباری معلومات پر قادر ہو گئے۔ رسائل نگاری شروع کر دی، آخر اس طوفان کا یہاں تک دل تبدھا کہ ایک اکیلے لاہور سے صرف ایک وقت میں ایک سو اخبار اور رسالے نکلنے لگے اور گنگا جمنی ناشر و ناظم برسات کی رنبیگی کی طرح کان پر قلم رکھے ملک میں جہاں تہاں گشت لگانے لگے، یہ قاعدے کی بات ہے، پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں،

انہیں میں سے یکایک ایک نو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پارٹی ایسی بھی نکل آئی جس نے حقیقی گر پہچان لیا اور ضرورتِ زمانہ کے مطابق ادب اردو کی ترقی کے لئے مخزن جیسا میگزین نہایت قابلیت اور خوبصورتی کے ساتھ جاری کر دیا، خان بہادر شیخ عبدالقادر بی اے اس کے راس الرئیس بنے۔ علامہ ڈاکٹر اقبال ایم، اے جیسا حقیقت نگار ان کا مددگار سید سجاد حیدر بی، اے (یلدرم) مولوی غلام بھیک نیرنگ وغیرہ جوان خیال وجوان اقبال نامہ نگاروں نے اسے چند ہی سال میں ماہواروں میں ہزار نگاہوں سے گذار دیا"

"مخزن" کی تعدادِ اشاعت کے بارے میں آغا صاحب کی اطلاعات یقیناً مبالغہ آمیز نہیں کہی جا سکتیں، کیونکہ مخزن اور سر عبدالقادر سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے، آغا صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام تیر و نشتر سنہ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ مخزن لمیٹڈ نے شائع کیا تھا "آفتاب" کا یہ دلچسپ مضمون جون سے اگست سنہ ۱۹۲۰ء تک مسلسل تین قسطوں میں چھپتا رہا، جولائی کے شمارے میں اردو ادب وصحافت کے نئے اتار چڑھاؤ پر بہت ہی بھیڑیے انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے اور اس "تنقید سے مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ مخصوص اسلوب نگارش بھی نہ بچ سکا جو اس زمانے میں ایک خاص مکتب خیال کے لئے اجنبی ہی تھا۔

"بزرگوں کی عظمت جدید تعلیم کی ہوا ہی جکی تھی اردو کے، ٹوکنے یا بات کاٹنے والا نام کو بھی کہیں نظر نہ آیا، بس پھر دیر کیا تھی، کھلے بندوں جدت طرازیاں ہونے لگیں اور اردو غریب کو کند چھری سے ذبح کرنے کا فتوائے عام ہو گیا، طبیعت میں جوانی کا زور، دماغ جدید علوم سے معمور، بازوؤں میں

کام کرنے کی قوت، آتے ہی اخباری دنیا میں اِس سرے سے اُس سرے تک دھوم مچادی، بڑے بڑے پُرانے "کرنیریے اخبار نویس" چیخ اُٹھے۔ مگر مولانا نے کسی کی ایک نہ مانی، اور عربیت کے زور و شور سے وہ گولے برسائے کہ ایک مدّتِ مدید تک انہیں کے الفاظ کی آواز بازگشت کے طور پر دشت و جبل سے آتی رہی مضمونِ خاص کے بدلے مقالہ افتتاحیہ، تبصرۂ صحافتِ حاضرہ وغیرہ اور نظم کا رنگ ہ۔

برنگِ شاخِ گُل لچکی کلائی کلامِ قوم ہے خواصِ تیتوں قلستاں پر

جہاں تہاں جاری ہو گیا اور ساری دنیا اسی رنگ میں شرابور نظر آنے لگی، آخر نظم و نثر کا یہ تموّج خدا کی زمین اور "زمیندار" کی مینڈھ مینڈھ سے گذرتا ہوا "بے آف بنگال" سے جا ٹکرایا، اور خاص کلکتے میں جہاں عبدالغفور خاں نسّاخ کا جنم بھوم تھا، وہیں وہیں ایک جلیل القدر ہستی، ایک لاثانی دماغ کے مالک ہمارے ایک محترم دوست کو بہ ادعائے فضل و کمال و بہ ثباتِ ہوش و حواس بھی مختل کر دیا، یعنی اپنے تئیں خاص اہلِ زبان ہوتے اور دلّی کے روڑے کہلانے پر بھی خیر سے اسی رنگ میں رنگ گئے، چنانچہ "الہلال" چمکا "البلاغ" نے دُور دُور پیام بَری کی اور باوصف ہمہ دانی خدا جانے کیا جاتی دُنیا دیکھی کہ آپ نے بھی ادب اردو کے نازنین تن بدن کو عربی اخبارات کے غیر مانوس ترجموں کے "بوجھل مواد" سے بالکل پکا پھوڑا کر ڈالا بلکہ بجی اللہ بجی اللہ بالکل ایک مکروہ ترین جذامی کی سی شکل پیدا کر دی۔

آپ کے کثیر التعداد مقلد ادھر ہی پل پڑے، اور ملک میں بنگالی اردو، پنجابی اُردو، پوربی اردو، اور مدراسی اردو کی دکانیں جابجا کھل گئیں، چنانچہ اعتذار، شذرات، اور خدا جانے کیا کیا بلا از قسم نوادرات آپ کی آزادانہ تجدید کی اب تک گواہیاں دینے کو موجود ہیں۔"

پہلی جنگِ عظیم کے بعد بیشتر نئی صحافتی اصلاحات کا آغاز مولانا ظفر علی خاں ہی خداداد صلاحیتوں کا رہین منت ہے، مقالہ افتتاحیہ، صحافت حاضرہ اور تبصرہ وغیرہ! "سنسنی خیز" کی صحافتی اصطلاح بھی پنجاب ہی سے آئی تھی یوپی میں سب سے پہلے غالباً سید جالب مرحوم نے اسے اپنایا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں اس کا بہت ہی مضحکہ اُڑایا گیا، ظریف لکھنوی نے بھی اس نئی اصطلاح پر چوٹ کی "سنسنی خیز" ہیں یہ بمبئی کے برقیات۔ جان لی "باؤلے" کی زلف کا سودا[1] (۲۰ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء کی فہرست مضامین درج ذیل ہے)

۱ - پہلی کرن۔ (مغربی روشنی کا دورِ جدید) آغا شاعر (ایڈیٹر)

۲ - نصف النہار۔ (لارڈ نارتھ کلف)

۳ - بہارِ بے قرار۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی

۴ - توپ۔ مہاراجہ جھالرا پاٹن

۵ - لالہ زار دا ٹلی۔ نصیر الممالک سفیر ایران

۶ - زیبِ چمن۔ آغا شاعر دہلوی (ایڈیٹر)

حصۂ نظم میں اکبر الٰہ آبادی۔ وحشت کلکتوی اور آغا تحسر لکھنوی کی غزلیں شامل ہیں۔

---

[1] عبد القادر باؤلا جو ممتاز بیگم کی محبت میں ہلاک کیا گیا تھا۔

اگست ۱۹۲۰ء (جلد ۵۔ شمارہ ۸) کے مضامین میں پہلا مضمون تو آغا شاعر کا ہی مضمون (مغربی روشنی میں اردو کا دورِ جدید) ہے جس کی دو قسطیں گذشتہ مہینوں میں چھپ چکی تھیں، مہاراجہ جھالراپاٹن کے ایک نئے مضمون "چاند" کی پہلی قسط اور خواجہ حسن نظامی د ماشد الخیری کے مضامین بھی شامل ہیں۔

آغا شاعر نے اپنے مضمون "مغربی روشنی میں اردو کا دورِ جدید" کی اس آخری قسط میں حیدرآباد دکن کی ادبی اور لسانی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے حیدرآباد کی "تحریکِ وضع اصطلاحات" کے سلسلے میں یہ مشورہ دیا ہے کہ متروکات کو جدید زبان سے علیحدہ رکھ کر آسان ترکیبیں اور اصطلاحات اردو زبان میں شامل کی جائیں؛ اور نثری اسلوبِ نگارش کو عام فہم اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس طرح ڈھالا جائے کہ اردو زبان عوام کے اور قریب ہو جائے اسی طرح نظم میں حقیقی جذبات، متانت، شائستگی اور فکر انگیزی کو اہمیت دی جائے اور قومی جذبات کو پوری اہمیت کے ساتھ ابھارنے کی کوشش کی جائے

اگست کے شمارے کے حصۂ نظم میں جاوید لکھنوی، برق دہلوی، عزیز لکھنوی رونق دہلوی اور رشید دہلوی کی غزلوں کے علاوہ وہ اکبر الہ آبادی کی نظم اور اسمٰعیل میرٹھی کی وہ مشہور کلاسیکی نظم (سونے کی چڑیا) بھی ہے جو ان کی ریڈروں میں شامل ہے

ستمبر کی فہرست مختصر بھی ہے اور کچھ بے جان بھی؛ زیادہ تر مضامین خود آغا صاحب کے لکھے ہوئے ہیں "مختصر نوٹ" کے تحت ماہنامہ کہکشاں لاہور پر تبصرہ کیا گیا ہے جو امتیاز علی تاج کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ "سوانح خواجہ غریب نواز" پر ریویو بھی ہے جسے کامل بک ایجنسی لاہور نے شائع کیا تھا

اسی شمارے میں پٹیالہ کے خلیفہ حامد حسین کی وفات پر اظہارِ تعزیت کیا گیا ہے جو اپنے زمانے میں پنجاب کے عمائدین میں شمار کیے جاتے تھے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء کی فہرست کافی طویل اور جاذبِ توجہ ہے۔

۱۔ پہلی کرن۔ برسات کی بہار اور کوہستان جھالاواڑ۔ آغا شاعر ایڈیٹر
۲۔ گلِ صد برگ۔ ؍؍
۳۔ جل ترنگ اور زندگی کے چند خوشگوار سانس۔ ؍؍
۴۔ چاند۔ مہاراجہ جھالرا پاٹن
۵۔ خاموش ہم نشین۔ نقاشش
۶۔ نصف النہار (بیوی کی عید۔ لونڈی کے ہاں محرم) راشد الخیری
۷۔ اردو نے معلّے اس کا نام ہے؟ فیض الدین دہلوی
۸۔ دھوپ چھاؤں۔ چھوٹے چھوٹے نوٹ حسین صدیقی
۹۔ اکبر اور نورجہاں علامہ عباسی گورکھپوری
۱۰۔ نئے نئے مضمون نگار سبق سیکھیں؟ ؛ دلکش مراد آبادی
۱۱۔ اناج کا نرخ۔ ؍؍
۱۲۔ جرمن کی حیرت انگیز ایجاد، کاغذ کا کپڑا۔ ؍؍

آغا شاعر کے مضامین میں "جل ترنگ" نہ محض ایک دلچسپ مضمون ہے بلکہ کافی معلوماتی بھی ہے، جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خود آغا صاحب کو موسیقی اور اس کے مروجہ سازوں سے کتنا گہرا لگاؤ تھا مگر ان کی یہ وابستگی کچھ زیادہ حیرت انگیز بھی نہیں ہے کیونکہ ان کی زندگی کا ایک دو ہندوستان

کی مشہور تھیٹریکل کمپنیوں میں گزر چکا ہے۔ آغا حشر نے ڈرامہ نگاری کی ابتدائی تربیت انہیں سے حاصل کی تھی۔ خود آغا صاحب اگرچہ مشاعروں میں تحت اللفظ غزل پڑھتے تھے لیکن ان کی آواز ترنم کی سحر آفرینیوں سے خالی نہیں تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ کلاسیکی موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ اس مضمون میں آغا صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"فن موسیقی کے اساتذہ قدیم نے صرف چار قسم کے باجے ہندستان میں ایجاد کیے، اور ان کی قسمیں صرف ان چار لفظوں پر محدود کر دیں۔ تنت، بتنت، گھن، اور سکھر۔ تنت یعنی تار کا باجا، جیسے سارنگی، طاؤس، ستار وغیرہ، بتنت یعنی تانت کا باجا، جیسے وائلن، فڈل، دلربا وغیرہ۔ گھن، وہ باجا جو چوٹ اور ہاتھ کی ضرب سے بجایا جاتا ہے۔ مثلاً نقارہ، طبلہ، پکھاوج وغیرہ۔ اور سکھر یعنی پھونک کا باجا، مثلاً شہنائی، بین، بانسری، الغوزہ اور نس ترنگ وغیرہ۔ مگر "جل ترنگ" ان سب سے الگ ہے، اس میں نہ تار ہیں، نہ تانت، نہ پھونک، اس لیے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ "جل ترنگ" ان قدیم باجوں کے بعد کی ایجاد ہے۔ بظاہر "جل ترنگ" کے لیے ساز وسامان کی کچھ ضرورت نہیں، تھوڑا سا پانی اور دو چھوٹی چھوٹی سی لکڑیاں کافی ہیں، چینی کے پیالوں کی تعداد جتنی چاہے وسیع کر سکتے ہیں مگر ان کا صحیح اندازہ بجانے والے کی قابلیت اور اس کے دل و دماغ سے تعلق رکھتا ہے اس میں مکمل باجوں کی طرح پورے سات سُر ہیں۔"

"اناج کا نرخ" اس شدید گرانی پر ایک طنز ہے جو پہلی جنگ عظیم کے

بعد ہندستان میں پیدا ہو گئی تھی، ماضی پرستی اور ماضی پسندی انسانی فطرت کی سب سے بڑی کمزوری ہے، اس دور کا انسان بھی اس زمانے کی شدید گرانی کے بوجھ سے کچلا جا رہا تھا اس لئے ماضی کے اوراق الٹ کر اپنے آپ کو تسکین دے لیتا تھا۔ کاش اس کی نگاہوں میں "آزاد ہندستان کا بھی کچھ تصور ہوتا اور وہ دیکھ سکتا کہ چالیس سال بعد جب یہی ہندستان صدیوں کی غلامی سے چھٹکارا پا جائے گا تو اس کا "معیارِ زندگی" اتنا بلند ہو جائے گا کہ اسے خوراک کا مسئلہ حل کرنے کے لئے دوسرے ممالک کا سہارا لینا پڑے گا۔ اور اجناس کی قیمتیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اس طرح ایک جگہ جم کر رہ جائیں گی جیسے ہمالیہ کی سر بفلک چوٹیاں ہزاروں برس سے ایک ہی انداز میں کھڑی ہیں۔ اس مضمون میں کوئی خاص بات نہیں رہی پرانا ڈھرا دہرا دیا گیا ہے۔

"شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں اناج کی جو بہتات تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد سے ہو سکتا ہے:۔

گندم پونے پانچ آنے من۔ چاول آٹھ آنے من۔ دال مونگ پونے آٹھ آنے من۔ دال موٹھ پونے پانچ آنے من۔ باجرہ ساڑھے پانچ آنے من۔ نمک سوا چھ آنے من۔ شکر ایک روپیہ سوا چھ آنے من۔ پیاز ڈھائی آنے من۔ گھی دو روپے دس آنے من۔ تیل دس آنے من اور ہلدی چار آنے من۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں۔

روپے کا چوبیس سیر گھی، اور چھ من دودھ ملتا تھا۔" ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد ۱۸۵۶ء۔ ۱۸۵۷ء میں گیہوں ۳۹ سیر فی روپیہ چنے ایک من ساڑھے

اُنیس سیر فی روپیہ، چاول ۱۸½ سیر فی روپیہ۔ گھی چار سیر اور دودھ روپے کا چار من ملتا تھا، یعنی ایک پیسے کا اڑھائی سیر۔

ملکہ وکٹوریہ کا عہد ۱۸۹۰ء۔ ۱۸۹۰ء میں گندم ۲۵ سیر فی روپیہ، چنے ۲۸ سیر چاول بارہ سیر، گھی دو سیر فی روپیہ، اور دودھ تین پیسہ فی سیر ملتا تھا ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں۔

حال کے ان دونوں سال کی ہولناک گرانی اظہر من الشمس ہے جس سے خلقت "الامان" پکار رہی ہے، کیونکہ گندم روپے کا آٹھ سیر، چنے چھ سیر، چاول چار سیر، دال تین سیر، اور گھی ساڑھے پانچ چھٹانک فی روپیہ ملتا ہے، دودھ جس میں آدھا پانی چار سیر۔

اکبر کے زمانے میں خرچ خوراک پانچ آنے ماہوار سے زیادہ نہ تھا مگر اب دس روپے ماہوار پر بھی آدمی کا پیٹ نہیں بھرتا۔"

نظم کے حصے میں پہلی ہی نظم ڈاکٹر اقبال کی "حقیقت آرائی" ہے جس کا پہلا شعر ہے؎

ہم نشیں افسانۂ بیداریٔ جمہور چھیڑ
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

پھر آصف علی بیرسٹر، سید محمد محسن وفا سیتاپوری، اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کی غزلیں ہیں۔

پیش نظر جلد میں نومبر اور دسمبر ۱۹۲۰ء کے دو شمارے اور بھی ہیں جن کے مضامین کی فہرست کو اسی آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے، جو اس سے

قبل کہیں مجملاً اور کہیں تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے، ان دونوں شماروں میں آغا شاعر کے مضامین نسبتاً سب سے زیادہ ہیں۔ مہاراجہ جھالراپاٹن کے پچھلے مضمون "چاند کی بقیہ قسط اکتوبر میں ختم ہوگئی، اب نومبر سے ان کا ایک دوسرا مضمون "سب بہترین" شروع ہوا، جو شائد کسی انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے، دسمبر ۱۹۲۰ء کے شمارے میں "خدا کے فضل سے دوبارہ زندگی پائی" کے زیر عنوان آغا صاحب نے آفتاب کے پہلے دور کا بھی ذکر کیا ہے۔

"یہی آفتاب اب سے دور خلد آشیاں ہو چکا تھا کوئی اس کے نام و نشان سے بھی واقف نہ رہا تھا۔ مگر عالی جاہ شیر دل، معاونِ علم و ادب کار دربار مہاراج رانا آف جھالاواڑ دام اقبالہٗ نے اسے پھر دوبارہ زندگی بخشی۔ اب کے وہ جس شان و شکوہ اور وقت کی پابندی کے ساتھ برآمد ہوا، صدہا انصاف پسند ہستیاں اس کی گواہ ہیں، ملک نے اس کی دل سے قدر کی اور عزز طبقے میں وہ بہترین ایڈیٹ پرچہ مان لیا گیا، پہلی مرتبہ تین سال کی جد و جہد میں بہ ہزار مشکل صرف تین سو خریداروں کی مستقل جماعت پیدا کی جا سکی تھی مگر اب کی دفعہ اسی دس مہینے میں خدا کے فضل اور سرکار دربار دام اقبالہٗ کے اقبال سے "الملک للہ" کی شان دکھاتا ہے۔"

"آفتاب" کا دوسرا دور کب تک قائم رہا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ "آفتاب" کے تیسرے دور کا مجملاً ذکر ضرور ملتا ہے۔

"دنیائے ادب میں آغا شاعر دہلوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، آپ عرصے سے ادبی خدمات میں مشغول ہیں۔ چنانچہ آپ کا ایک دیوان بھی شائع

ہو چکا ہے، ہمارے لئے خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ اچھے نثر نگار بھی ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے باکمال ادیب کی نگرانی میں جو ادبی خدمت بھی کی جائے گی وہ گرانقدر ہوگی، چنانچہ ہمارے دفتر میں "آفتاب" لاہور جو جناب ممدوح (آغا شاعر) کی نگرانی میں اردو کی شاندار خدمات انجام دے رہا ہے، ریویو کی غرض سے موصول ہوا ہے۔

رسالے کا حجم ۴۸ صفحات قیمت سالانہ مع محصولڈاک چار روپے ہے، لکھائی چھپائی اچھی ہے، کاغذ بھی بُرا نہیں ہے، اس گلدستے میں نظم اور نثر دونوں چیزیں ہیں، مضامین زیادہ تر افسانے کی حیثیت رکھتے ہیں شیکسپیئر کے مشہور تاریخی ڈرامہ "جولیس سیزر" کا فہمیدہ ترجمہ بھی شائع ہو رہا ہے، اور بھی دلچسپ مضامین ہیں، بعض لفظوں کی ادبی تحقیق بھی شاعر صاحب کی ہے لیکن ہمیں یہ شکایت ضرور ہے کہ شاعر صاحب کی نفیس غزل تو حصۂ نظم کی رونق بڑھا رہی ہے لیکن نثر میں ان کا کوئی مضمون نہیں ہے جس کا باعث شائد ہمارے ممدوح کی کثرتِ افکار ہے، رسالہ مجموعی حیثیت سے اس قابل ہے کہ اس کی ہمت افزائی کی جائے۔ آگے چل کر یہ مجلّہ بہت جلد اردو رسائل کی صفِ اول میں ممتاز جگہ حاصل کرلے گا، ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ ۲ اپریل سنہ ۲۶ء

"آفتاب" کا یہ آخری دور تھا، کرتا دھرتا تو آغا صاحب ہی تھے لیکن بحیثیت ایڈیٹر ان کے شاگرد دیوان شرر کا نام شائع ہوتا تھا، اس دور کا کوئی پرچہ مجھے دستیاب نہ ہو سکا۔

اپنے پہلے دور میں "آفتاب" نے تین سال کی عمر پائی اور میرا خیال ہے کہ

دوسرا دور بھی کم و بیش ایسا ہی رہا ہوگا، اس دور میں جھالرا پاٹن کے والئی ملک کی سرپرستی نے اسے کافی چمکایا، ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا تھا، سالانہ چندہ ۲ روپے اور ششماہی (مع محصولڈاک) ایک روپیہ تھا ایک شمارے کی قیمت ۳/ تھی۔ جھالرا پاٹن کے علاوہ دوسری ریاستوں سے بھی اسے مالی امداد ملا کرتی تھی اور خریداروں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا۔

آغا شاعر اپنے دوسرے دہلوی معاصرین کی طرح بامحاورہ سلیس اردو لکھنے میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے، اسی کے ساتھ انہیں لغات پر اچھا عبور بھی تھا۔ نظم کے میدان میں وہ ایک کامیاب غزل گو ہی نہ تھے بلکہ ایک اچھے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں بھی تھے، وہ صاحب طرز تحت اللفظ بھی تھے۔ حیدر آباد، پنجاب، دلی، یوپی، اور سندھ کے مختلف مقامات پر انہوں نے دس دس ہزار کے مجمع میں اپنے رزمیہ مراثی پڑھ کر اس زمانے میں دھوم مچادی تھی۔

(منقول از ہماری زبان علیگڈھ جنوری ۱۹۶۳ء)

آصف الاخبار

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

آصف الاخبار جو آغا شاعر صاحب کے زیر اہتمام نکلتا ہے۔ میں نے بالاستیعاب اتنے پرچے دیکھے ہیں کہ میں اس کی وضع کو خوب پہچان چکا ہوں، مضامین کے بارے میں تو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، کیونکہ لوگوں کے مذاق طرح طرح کے ہیں، ہاں زبان کی نسبت اور زبان میں اس کی سبھی شانیں آگئیں۔ میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے جتنے اخبار میری نظر سے گذرے اور شائد ہی کوئی ایسا ہو جو میری نظر سے نہ گذرا ہو، اس کی سی زبان، زبان کی برجستگی، محاورہ، روزمرہ، آمد، میں تو کسی اخبار میں نہیں پاتا۔ زبان کے اعتبار سے دہلی اس کو شیلاں ہے اور یہ دہلی کو۔ نقص اگر ہے تو اتنا کہ بیان واقعات میں شاہی کی جھلک مارتی ہے۔

(شمس العلماء) نذیر احمد ۲۵ اکتوبر ۱۹۰۳ء

میرزا منش

نیاز فتحپوری

اگر آغا شاعر مرحوم کے بابت مجھے اپنے تاثرات صرف ایک فقرہ میں ظاہر کرنے پر مجبور کیا جائے تو میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاؤں گا کہ

"آغا شاعر بڑے عجیب و غریب میرزا منش انسان تھے"

گو کسی انسان کے عجیب و غریب و میرزا منش ہونے کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی کم عجیب و غریب نہیں!

میں اسی شخص کو عجیب و غریب یا میرزا منش کہوں گا جس کی ذات میں متعدد شخصیتیں شامل ہوں اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ اتنی دلکش و دلچسپ ہو کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ذوق پر بار ہو۔

مرحوم اپنی وضع و صورت، سج دھج، ذوق و شوق، تہذیب و شائستگی، اور رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے بالکل ایرانی انسان تھے۔ وہی دلکش ادائیں، وہی دلکش انداز گفتگو اور وہی دل لبھانے والا لب و لہجہ!

بد قسمتی سے مجھے اُن کی صحبت سے لطف اٹھانے کا موقع بہت کم نصیب ہوا۔ صرف دو یا تین مرتبہ اور وہ بھی رواروی میں چند منٹ کے لئے، لیکن باور کیجئے میں نے اس مختصر فرصت میں بھی ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ "مجھ سے اتنی محبت کرنے والا شخص شائد ہی کوئی دوسرا ہو۔

جس وقت ان کا سینہ میرے سینہ سے مس ہوتا تھا تو میں ایسا محسوس کرتا تھا گویا میرے جسم میں کوئی نئی روح سمائی جا رہی ہے اور میں اُن کے جذبات کی گرمجوشی سے اندر ہی اندر پگھلتا جا رہا ہوں۔

خود اُن کے فرط تاثر کا یہ عالم تھا کہ اگر میں انہیں گریۂ مجسّم کہوں تو ایسا کہنا غالبًا غلط نہ ہوگا۔ اُن کی آنکھیں ہر وقت نم آلود رہتی تھیں اور آواز گلوگیر۔

بات کرتے کرتے رو پڑنا اور روتے روتے وہ سب کچھ کہہ جانا جو ہنسی ہی میں کہا جا سکتا تھا۔ ان کی وہ فطری خصوصیت تھی جس کی دوسری مثال میری نگاہ سے کبھی نہیں گذری۔

وہ نہ صرف دبستان داغ کے بڑے خوش گو و پر گو شاعر تھے۔ بلکہ اس تہذیب و روایات زندگی کے بھی بہترین نمائندے تھے جو دلّی اُجڑی ہوئی ثقافت، دلّی کے مشاعروں، دلّی کے چاندنی چوک، دلّی کی مسجد جامع اور دلّی کے اکابر علم و ادب سے مخصوص تھی۔

مرحوم کی زندگی بڑی ڈانواں ڈول بسر ہوئی اور کبھی ایک جگہ جم کر بیٹھ جانے کا موقع انہیں میسر نہ آیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی خدا ساز بات تھی، ورنہ ان کی عظیم شاعرانہ اہلیت غالبًا بیناکہ سر بند رہتی اور دنیا کو اس کی لطافت و پاکیزگی سے استفادہ کا موقع کم ملتا۔

وہ ایک شاعر تھے اور یہی ان کی زندگی کا وہ حسن تھا جس نے ان کی شاعری کو شہرت دوام عطا کی۔

کراچی $\frac{۲۳}{۴}$ ۶۴ نیاز فتح پوری

رنگین مزاج

مُلّا واحدی دہلوی

"حضرت نظام الدین" نام ریلوے اسٹیشن اب ہمایوں کے مقبرے سے آگے ہے پہلے منصور کے مقبرے کی طرف تھا، ریل کی سڑک بہت اونچائی پر تھی اور اسٹیشن بہت نیچے، جیسے کالکا شملہ ریلوے کے اسٹیشن ہوتے ہیں۔ ساون کا مہینہ تھا، میں دلی آنے کے لیے ریل کی پٹری کے قریب کھڑا ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کہ بارش آگئی اور مجھے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں پناہ لینی پڑی، ویٹنگ روم کہیے یا ویٹنگ روم ہال کہیے۔ آپ نے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن دیکھے ہوں گے ایک طرف ٹکٹ گھر ایک طرف اسٹیشن ماسٹر کا کوارٹر۔ دونوں کے بیچ میں تھوڑی سی زمین پر چھت ایسی ہی چھت کے سائے تلے کچھ سفید پوش شاگرد اپنے ممتاز استاد سے ملی جلی بے تکلفی اور عقیدت کے ساتھ باتیں کرتے جاتے تھے اور موسم کا لطف لیتے تھے کہ استاد کی زبان سے لکایک نکلا،

ترے قربان اے مطرب، سنا دے کوئی موسم کی

اور پھر شعروں کا مینھ برسنے لگا۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے، جان بے کل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی

کہاں جاتے ہے، تھم تھم کر چلو، ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو خدا رکھے نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تم نظر آؤ
زمانے بھر کا جھوٹا، کیا حقیقت ساغر جم کی

نہیں ملتے، نہ ملئے، خیر کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی

گھٹائیں دیکھ کر بے تاب ہے، بے چین ہے شاعر
ترے قربان او مطرب سنا دے کوئی موسم کی

آپ پہچانے اس شاعر کو یہ آغا شاعر تھے اور ان کی یہ مشہور غزل اس طرح نازل ہوئی تھی، میں نے ان کا نام بہت سنا تھا، لیکن زیارت آج پہلی دفعہ ہوئی اور ملاقات آج بھی نہیں ہوئی، میں طالب علم تھا اور آغا اور ان کے ساتھی پختہ عمر کے، مجھے اس صحبت کو دور ہی سے دیکھنے کا حق تھا اور اس کی پوری تفصیل بیان کرنے کا آج بھی حق نہیں ہے۔

ریل آگئی، میں بھی سوار ہوا، اور آغا اور ان کے ساتھی بھی، آغا مرتے دم تک جوان رہے، یہ جس زمانے کا ذکر ہے وہ آغا کی جوانی کا زمانہ تھا۔

آغا شاعر کی میرے نزدیک تین خصوصیتیں تھیں، ایک نظم و نثر دونوں پر قابو، دوسرے دلّی کی محبت، تیسرے زندہ دلی اور رنگین مزاجی، شاعر اور بھی بے شمار ہیں، لیکن آغا شاعر پر شاعری اس طرح چھاگئی تھی جس طرح وہ شاعری پر چھائے ہوئے تھے، وہ شعر کہتے ہی نہ تھے، خود مجسم شعر تھے۔

جسم پر کامل بڑھاپا آگیا ہے، چلنا پھرنا تک دشوار ہے، خانگی پریشانیاں بھی ہیں، دل نڈھال نڈھال رہتا ہے، صحن میں چارپائی پر لیٹے ہیں، سامنے زینے سے حلال خوری اُترتی ہے، اس کا گھونگھٹ ہٹ گیا یا لیٹے لیٹے نظر پڑگئی گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے۔ ”ارے بی، تم تو نور جہاں ہو“۔

میری پہلی ملاقات آغا شاعر سے شیخ محمد عبدالقادر صاحب مرحوم ایڈیٹر رسالہ مخزن (بیرسٹر ایٹ لا) کے ہاں ہوئی، شیخ صاحب کا مکان یا مخزن کا دفتر میرے مکان کے قریب تھا، شیخ عبدالقادر صاحب (آنریبل سر عبدالقادر) روزانہ شام کو یہاں آکر بیٹھتے تھے اور دلّی کے لکھنے والوں کا شیخ صاحب کی وجہ سے خاصا مجمع ہو جاتا تھا، شیخ صاحب دلّی کے لکھنے والوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے تھے، اور ان سے تعلقات بڑھاتے تھے مجھے بھی سامع کی حیثیت سے شیخ عبدالقادر صاحب کی اس مجلس میں حاضر ہونے کا موقع ملا کرتا تھا، اور وہاں میں محسوس کرتا تھا کہ دلّی کی محبت آغا شاعر کے دل میں کتنی ہے۔ ذرا سی کوئی بات شیخ صاحب کے کسی مہمان کی زبان سے بھی

ایسی نکل گئی جس سے دلی کی سُبکی ہوتی ہے تو بس آغا صاحب بگڑ گئے، اور اب سنبھالے نہیں سنبھلتے، خود شیخ صاحب نے کہیں کسی محاورے پر اعتراض کیا کہ یہ یوں ہے اور آغا صاحب کو غصہ آیا "تم کیا جانو" میں نے اپنی ماں کو اسی طرح بولتے سنا، اپنے باپ کی زبان پر بھی یہی الفاظ پائے" شیخ صاحب کہہ رہے ہیں، آغا صاحب آپ ماں باپ کے ان معاملوں میں بڑے تابعدار ہیں، آپ کے والد ماجد تشریف لائے تھے وہ فرماتے تھے کہ آغا پر بڑھاپا آچلا، مگر وہ اب تک میری بات نہیں سنتا۔

شائد بیس برس کی بات ہے، یاد نہیں کون سی ریاست تھی، بہرحال ایک ریاست سے آغا صاحب کا تعلق ہو گیا تھا، چھٹی لے کر آئے، چاندنی چوک میں دریبے کے نکڑ پر سامنے پڑ گیا، پکڑ لیا، چمٹ گئے اور رونا شروع کر دیا۔ ہائے دلی، ہائے دلی والو، ارے ترس گیا تمہاری شکلوں کو ترس گیا، دلی کی گلیوں کو ترس گیا، دلی کے بازاروں کو، جنگل میں پڑا ہوں گنواروں میں پھنس گیا ہوں۔ باوا جب تک زندہ رہے، اللہ جانے کہاں سے روٹی مل جاتی تھی، ان کی جائداد تباہ ہو گئی تھی۔ پھر بھی ان کے دم سے برکت تھی، ان کے اٹھتے ہی خاک اڑنے لگی، ورنہ دلی بھلا مجھ سے چھٹتی آنسو بہتے جاتے ہیں اور منہ سے پھول جھڑتے جاتے ہیں۔

میں نے جو کچھ کہا، آغا کے جذبات ہیں، آغا کے الفاظ نہیں، آغا ہر وقت بولتے رہتے تھے، بلند آواز سے بولتے تھے، بڑی اچھی مردانہ آواز تھی، غزل بھی خوب پڑھتے تھے اور مرثیے بھی، مرثیے دس ہزار کے مجمعوں میں

یں نے سُنے ہیں۔ ہندوستان کے غیر معمولی پڑھنے والوں میں تھے۔
لیکن خدا کی شان، آخری زمانے میں بڑھاپے کا اثر سب سے زیادہ
ان کی آواز پر پڑا۔ چہرہ بھی اپنی خوب صورتی کو یاد کرکے مرجھا گیا تھا،
اور سارا جسم کھوئی ہوئی رعنائی کے فراق میں مضمحل تھا، مگر آواز کی
حالت بہت دردناک تھی۔ بولنا چاہتے تھے، مگر کمزوری کی وجہ سے
بول نہ سکتے تھے۔

(منقول از شعلہ و شبنم شاعر نمبر ۱۹۵۴ء)

دِلّی کا آخری شاعر

وجاہت حسین سونی پتی

حضرت آغا شاعر دہلوی اُن باکمال شعراء کی صف میں تھے، جنہوں نے اردو زبان کو نظم و نثر کے ذریعے وسعت و مقبولیت دی اور اس میں ایک ہمہ گیر دلکشی پیدا کی، اردو ادب کے ناقدین نے آغا شاعر کو دلّی کا آخری شاعر بھی کہا ہے آغا صاحب، حضرت داغ دہلوی کے جانشین تھے۔ داغ کے دیگر چند جانشینوں پر انہیں اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے اُستاد کے اندازِ فکر اور اسلوبِ فن کو برقرار رکھا بلکہ اردو غزل کے بناؤ سنگھار پر بھی بڑی توجہ دی، اس کے علاوہ انہوں نے اردو شاعری میں متانت اور سنجیدگی کے اُن نقوش کو بھی اُبھارا جنہیں داغ مرحوم کے مزاج نے مدھم رکھنا پسند کیا تھا۔ اُن کے ہاں شوخئ فکر تو وہی ہے۔ لیکن بیباکی نہیں، احتیاط اور میانہ روی ہمیشہ اُن کا مسلک رہا۔

آپ کا نام ظفر علی اور تخلص شاعر تھا، آپ نے داغ اور حالی کے عہد کی دہلی کے بھرپور شعری و ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں، پیدائش سنہ ۱۸۷۱ء میں ہوئی، آپ کے بزرگ ایران سے نادر شاہ کے ہمراہ دہلی آئے اور پھر یہیں بس گئے۔ آغا شاعر نے تعلیم کے مرحلے بڑی کامیابی کے ساتھ عربک اسکول دہلی میں طے کر لیے۔ شعر گوئی کی ابتداء نے شعور کی بیداری کا اعلان کیا۔ حضرت داغ

دہلوی کے حلقۂ شاگردی میں آگئے، ذہین تھے۔ اُستاد کی اصلاح نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور وہ اس بلندی تک پہنچ گئے کہ بعد کو داغ کی جانشینی کا منصب بھی مل گیا۔ آغا شاعر کے ہاں داغ کی ذہنی داخلیت وخارجیت کے خاکے بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔

آغا شاعر نے جس قدر اردو محاورات جزوِ شعر بنائے ہیں ان میں بیشتر شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اس کا سبب محض زبان کا فرق ہے، داغ کے زمانے تک اردو بہت صاف، سلیس اور شستہ ہو چکی تھی، آغا شاعر نے زبان پر اپنی قدرت کا یہ ثبوت دیا کہ محاوروں کو تخیل کی انفرادیت اور زبان وبیان کی حلاوت سے موثر بنایا۔

مفکرین عموماً اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ زبان کوئی بھی ہو جس پر کامل عبور حاصل کرنا ممکن نہیں، تاہم اگر کسی کو اردو پر عبور تھا، تو اپنے وقت میں وہ آغا شاعر کی ذاتِ گرامی تھی، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انہوں نے قرآن پاک کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے، کسی زبان کے خیالات، مفہوم اور مطالب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا، انتہائی دشوار کام ہے چہ جائیکہ قرآنِ پاک کے مطالب، پھر ترجمہ اگر منظوم ہو تو یہ کام دشوار تر ہو جاتا ہے، وہی اہلِ زبان اس کام کو انجام دے سکتے ہیں جنہیں زبان پر پورا عبور حاصل ہو آغا شاعر کا یہ اردو منظوم ترجمہ بہت بڑا ادبی وعلمی کارنامہ ہے، یہ اردو زبان پر اُن کی قدرت کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

اس ترجمہ کے علاوہ انہوں نے عمر خیام کی رباعیات کا اردو ترجمہ

"خمکدۂ خیام" کے نام سے پیش کیا جس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی الفاظ کے اصل مفہوم اور موضوع کی روح کو بڑے ہی بلیغ انداز میں برقرار رکھا گیا ہے، جو کیفیت فارسی رباعیات میں ہے وہی کیفیت تاثیر اور خلوصِ فکر ترجمے میں موجود ہے۔ کئی دیگر شعراء نے بھی عمر خیام کی رباعیات کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے لیکن ناقدین نے متفقہ طور پر آغا شاعر کے ترجمے "خمکدۂ خیام" کو سب سے بہتر اور موثر قرار دیا ہے۔ آغا شاعر کی اس تخلیق نے اردو ادب کے سرمایے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے انہوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس کا مکمل اندازہ ان کی نثری تخلیق کو سامنے رکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شاعر ہونے کی حیثیت کے علاوہ بطور ادیب بھی ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔

آغا شاعر کے ہاں روایتی تصوّر ضرور ملتا ہے لیکن ان کے انداز بیان اور قادر الکلامی کے جوہر نے اس تصور میں بھی بڑی جاذبیت پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے روایت بھی ایک نئے روپ میں نظر آتی ہے، ان کے روایتی تصور میں بھی ایک بات ہوتی ہے، بڑی جاندار بات، جو مستقبل کے تصورات کی نشان دہی کرتی ہے، آج کی کہی ہوئی بات میں اگر مستقبل کی جھلک نہ ہو تو یہ روایت پرستی کی مظہر ہے، اور اگر نصف صدی پیشتر کہی ہوئی بات میں آج کی جھلک موجود ہے تو اسے روایت پرستی کی زنجیروں میں مقید کہنا غلط ہے۔ آغا شاعر کی شاعری کو روایتی تصور کا الزام دینا صحیح نہیں، انہوں نے عشق و محبت کے ایسے مسائل کو جزوِ شاعری بنایا ہے جو غالباً انسان کے دل میں صبحِ ازل کی سب سے پہلی کرن نے پیدا کئے تھے اور جو شامِ ابد تک زندہ و

سلامت رہیں گے۔

موضوع، غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں، محبوب کے حسن و جمال کا تذکرہ ہو یا عاشق کے فراق زدہ لمحات کا، حسن کی بے مہری کا قصہ ہو یا عشق کی دربدری کا، بہاروں کا رنگین افسانہ ہو یا خزاں کی اداس سرگذشت، دل کے معاملات کی حکایت ہو یا دیدۂ حیراں کا تذکرہ، آغا شاعرؔ ان تمام کیفیتوں کی عکاسی کے لئے جن الفاظ کو منتخب کرتے ہیں وہ اسقدر مناسب اور ادائیگی کے لئے اسقدر مکمل ہوتے ہیں کہ ان سے بہتر الفاظ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ کا یہ اہتمام صرف چند اشعار ہی میں نہیں بلکہ ان کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے درحقیقت یہ خوبی بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ انہیں اردو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور ان کے ذہن میں الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ موجود تھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں، موضوع کے لئے الفاظ کا انتخاب حسین ہے جس میں شعریت بھی ہے اور تاثیر بھی۔

سبزے کی لہک، پھول کی خوشبو، نمِ شبنم
ہر ایک میں ہوتے ہیں وہ انداز بدل کے

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے، جان بے کل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی

جگر کے ساتھ درد، دل کے ساتھ اضطراب، جان کے ساتھ بے کل

کتنا تناسب اور کتنا توافق موجود ہے، یہ آغا شاعر کا کمالِ خاص ہے کہ وہ الفاظ کے انتخاب اور اپنے طرزِ ادا سے تیکھا پن پیدا کر دیتے ہیں۔

آغا شاعر کے بارے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ محض اپنے زورِ بیان اور کمالِ فن سے ان موضوعات کو بھی اک نیا اور عام فہم روپ دیتے ہیں، جن پر اساتذہ طبع آزمائی کر چکے ہیں ؎

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

اس موضوع کو ذرا سے فرق کے ساتھ امیر مینائی نے یوں پیش کیا ہے ؎

تنہا نہیں چلا ہوں عدم کو میں اے امیر
دل میں کسی کی یاد لئے جا رہا ہوں میں

اس موضوع کو آغا شاعر نے بھی جزوِ شعر بنایا ہے، خوبی یہ ہے کہ ان کے شعر میں حسن و اثر بھی ہے، حقیقت کی روح بھی اور نیا پن بھی ؎

کچھ نہ کچھ عالم ایجاد نے بخشا ہم کو
خالی ہاتھ آئے تھے اب جائیں گے حسرت لے کر

آنسو، محبت کی آنکھ سے ضرور بہتے ہیں، ان آنسوؤں کو شعراء نے اپنے تخیل سے دلفریب چمک دی ہے۔ آنسوؤں کی مختلف تصویریں اردو

شاعری کے نگار خانے میں موجود ہیں، آغا شاعر نے بھی آنسوؤں کی بڑی مؤثر تصویریں کھینچی ہیں، لیکن یہاں اس کے صرف تین نمونے پیش کیے جاتے ہیں جو خاص طور پر قابلِ غور ہیں، ان میں زندگی کے جن تین پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اردو ادب میں موجود تو ہیں لیکن آغا شاعر نے ان میں جس رنگ و خط سے نکھار پیدا کیا ہے وہ صرف انہی کا حصہ ہے، آنسو کی پہلی کیفیت کی تصویر محبت دوسری یاسیت، اور تیسری غریب الوطنی سے تعلق رکھتی ہے۔

محبت بھی کیا چیز ہے؟ دیکھنا ÷ ادھر بات کی، چشم تر ہو گئی

حالت پہ میری ان کے بھی آنسو نکل پڑے ÷ دیکھا گیا نہ یاس میں عالم نگاہ کا

چوٹ سی دل پہ لگی، آنکھ میں آنسو بھر آئے

جب کبھی عالمِ غربت میں وطن یاد آیا

ایک غزل گو کی حیثیت سے آغا شاعر کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ انہوں نے داغ کے رنگ کو خوب نبھایا بلکہ غزل کی رنگ آمیزی کی خاطر چند کامیاب تجربے بھی کیے، انہوں نے داغ کے مخصوص انداز کی پیروی کی ہے۔ مگر اس میں کچھ اپنا خاص اسلوب بھی اجاگر کیا ہے، غزل کے میدان میں جہاں نے نئی کروٹیں بدلیں، جدید غزل نے غزل کی ہیئت ترکیبی کو بھی متاثر کیا۔ لیکن

ان سب تبدیلیوں کے باوجود آغا شاعر کا اندازِ غزل اس سج دھج کے ساتھ تابندہ ہے کہ یہ کہنا غلط نہیں کہ انہوں نے اردو غزل کے دامن کو ایک نادر سرمائے سے بھر دیا۔

غزل کا پیمانہ تنگ ہو جاتا اگر اسے مجتہد غزل گو شعراء نہ ملتے، آغا شاعر نے غزل کے ذریعے صرف زبان ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ فکرِ شعراء کو دعوتِ جستجو بھی دی، انہوں نے تلاشِ مضمون کے سلسلے میں پروازِ فکر کے ناقابلِ فراموش جوہر بھی دکھائے، سلاست، روانی اور بے ساختہ پن کی وجہ سے ان اشعار میں بہ ظاہر آمد کا انداز ہوتا ہے لیکن بہ باطن یہی گمان ہوتا ہے کہ شعر خاصی کاوش کے بعد تخلیق ہوا ہے

ان کے فکر کی بلندی، تلاشِ مضمون کی مظہر ہے، ان کے فن کی پختگی تاثیر شعر کی منہ بولتی تصویر ہے، ان کی مشقِ سخن، ان کی قادرالکلامی ان تمام باتوں نے ان کی شاعری کو محاسن کا ایک گنجینہ بنا دیا ہے، وہ اپنے اظہارِ خیال میں بڑے بے تکلف نظر آتے ہیں، یہی بے تکلفی ان کے اشعار میں ایک غیر فانی زندگی پیدا کر دیتی ہے، ان کے بعض اشعار میں فکر کے علاوہ جذبے کی شدت بھی موجود ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ جذبے کی قوت کو اپنے اشعار سے خارج نہیں کرتے، ایسے اشعار جن میں جذبے کی شدت اور تلاشِ مضمون کے علاوہ بے تکلفی بھی موجود ہے آغا شاعر کے فن و فکر کے شاہکار ہیں، اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تو ہم بتائیں غنچہ و گل میں ہے فرق کیا ؛ اک بات ہے کہی ہوئی اک بے کہی ہوئی

اس مطلع کو دیکھئے کس قدر موثر کس قدر سادہ اور کس قدر معنی آفرین ہے ؂

مٹتے مٹتے بھی محبت کا نشاں رہتا ہے
بجھتے بجھتے بھی سر شمع دھواں رہتا ہے

اور اس شعر میں ندرتِ فکر اور منفرد اندازِ بیان کا طلسم بھی دیکھئے

پہرا بٹھا دیا ہے یہ قیدِ حیات نے
سایہ بھی ساتھ ساتھ ہے جاؤں جہاں کہیں

"سایہ" کو پہرے دار کہنا، یہ آغا شاعر ہی کا حصہ ہے، اس سے بیشتر شعراء نے موت کو پہرے دار یا محافظ کہا ہے اس لئے کہ یہ سائے کی طرح انسان کے ساتھ ساتھ ہے، انسان جہاں کہیں بھی جائے موت تعاقب کرتی ہے اس سے علیحدہ نہیں ہوتی، لیکن موت کے تصوّر میں جو بھیانک پہلو ہے وہ "سایہ" کے لفظ میں نہیں۔ آغا شاعر نے موت کی بجائے "سایہ" کو "پہرے دار" ٹھیرا کر دراصل اس بھیانک تصور کو ایک گوارا صورت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

آغا شاعر کے الفاظ اور تخیل کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے۔ اسلئے ان کے بیان کردہ موضوع یا پیش کردہ کیفیت کو سمجھنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی، ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا تخیل مُردہ الفاظ کو کندھا دینا پسند نہیں کرتا۔ بہ ایں سبب

ان کی شاعری میں ایک خوشگوار تاثر موجود ہے، وہ غم انگیز بات بھی کہتے ہیں، لیکن دل پر اس بات کے اثرات بڑے ہی حسین انداز میں مرتب ہوتے ہیں اس ضمن میں مندرجہ ذیل اشعار ناقابلِ فراموش ہیں ؎

دل پھونک دیا کرتے ہیں اُلفت کے پتنگے
یہ آگ کسی کو بھی بجھانی نہیں آتی

شعلۂ عشق جان لے کے رہا ٭ بہہ گئی شمع، غم میں گھُل گھُل کے

اردو غزل کے اس منفرد شاعر نے دہلی میں ۱۹۴۰ء میں وفات پائی انہوں نے اپنی نظم و نثر کے ذریعے اردو زبان اور فنِ سخن کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

(منقول از ماہِ نو کراچی اپریل ۱۹۶۶ء)

شاعرِ ماحتشم

رضا علی وحشت

مرحوم آغا شاعر کا درجہ اُن کے معاصرین میں کیا تھا، اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، کیونکہ بدقسمتی سے گروہِ شعراء میں عموماً باہمی حریفانہ چشمکیں رہا کی ہیں لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مرحوم کی طبیعت شاعرانہ تھی وہ ہمہ تن شعر تھے، اُن کو جو دیکھتا تھا متاثر ہو جاتا تھا، مجھے خوب یاد ہے جب میں نے پہلی دفعہ اُن کو دیکھا تھا۔ کلکتے میں ایک نہایت پُر فضا باغ لبِ دریا واقع ہے اس کو ایڈن گارڈن کہتے ہیں، شام کو لوگ تفریح کے لئے وہاں جایا کرتے تھے، بیٹھنے کو بینچ رکھے ہیں، میں نے ایک خوش رُو جوان کو جس کی وضع میں ایک خاص دلکشی تھی ایک بینچ پر بیٹھا دیکھا، اس کے ساتھ دو تین نوجوان تھے، جن سے وہ باتیں کر رہا تھا، اس کی گفتگو میں ایک عجیب گھلاوٹ تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی شاعر ہے، اسی دن مرحوم نواب نصیر الممالک میرزا شجاعت علی بیگ خان بہادر قنصل جنرل ایران کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا (انہیں نواب صاحب کے ذریعے ان کو افسر الشعراء کا خطاب بھی ملا تھا)۔ غزل لے کر میں بھی گیا دیکھا تو وہ خوش رُو جوان وہاں موجود ہے! اس وقت معلوم ہوا کہ آغا شاعر یہی ہیں، میری غزل پر انہوں نے بڑی فراخ دلی سے داد دی اور اسی دن سے میرے اُن کے درمیان موانست قائم ہو گئی۔ مرحوم نے

جس انداز سے غزل پڑھی، اس کا اب تک دل پر اثر باقی ہے، اب تو مشاعروں میں لوگ عموماً ترنم سے غزل خوانی کرتے ہیں، جس کی آواز میں زیادہ موسیقیت ہوتی ہے وہ اُتنا ہی کامیاب رہتا ہے۔ کلام کی خامیاں اُس وقت نظر نہیں آتیں ترنم کی کیفیت سامعین پر چھا جاتی ہے۔

آغا شاعر بخت اللفظ شعر خوانی کرتے تھے اور جب تک جوانی کی قوت قائم رہی اُن کی خواندگی عدیم المثال تھی، غزل پڑھنے سے پہلے اپنے اُستاد حضرتِ داغ کے دو شعر تبرکاً پڑھا کرتے تھے، اور اسی وقت ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ ایک دفعہ داغ کا یہ مطلع پڑھا۔

وہ مزے عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

کلیجے پر ہاتھ رکھ کر جب کہا، جی جانتا ہے تو محفل کی محفل محو ہو گئی اب تک وہ سماں میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ انہوں نے غزل خوانی میں وہ تاثیر پیدا کی کہ لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔

جہاں کہیں مشاعروں میں ہوتے تھے ان کی شخصیت بہت نمایاں رہتی تھی۔ ان کی شرکت سے محفلوں کی رونق تھی، گفتگو اُن کی بہت دلکش ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ پہروں ان کی صحبت میں بیٹھے رہیئے۔ ایسے موقعے مجھے بہت ملے، جن کی یاد ابھی تک دل میں ہے۔

قطعہ

جبکہ آغائے محترم شاعر ٭ سوئے دارالبقا ہوئے راہی
شعرا میں بپا ہوا ماتم ٭ عام ہے شغلِ نالہ و زاری
آج دہلی کی اٹھ گئی رونق ٭ محفلِ شعر ہو گئی خالی

فکرِ تاریخ جب ہوئی وحشتؔ
شاعرِ محتشم صدا آئی

۱۳۵۹ ہجری

(منقول از چمنستان مارچ سنہ ۱۹۴۱ء)

بیسویں صدی کا غزل گو

سید وقار عظیم

اب سے کوئی تینتیس چوبیس برس پہلے کی بات ہے، گرمیوں کے دن تھے، ہم سب شام کا کھانا کھا کر بیٹھے تھے۔ والدہ مرحومہ نے پاندان کھولا سب چھوٹے بڑوں کو پان دیئے اور پاندان اندر چوکی پر رکھوا دیا، بچوں کے لئے اب کہانی سننے اور سو جانے کے سوا کوئی شغل باقی نہ رہا تھا کہ اتنے میں والد صاحب مرحوم بولے، بھئی باجا کون کون سنے گا؟ ہم سب یک زبان ہو کر بولے "ہم" نوکر کو آواز دی، وہ گراموفون اٹھا کر لایا، والد صاحب اسی دن کچھ نئے ریکارڈ بازار سے لائے تھے اس لئے باجا سننے کے شوق میں اور بھی تیزی پیدا ہو گئی تھی، اس دن جتنے نئے ریکارڈ بجے ان میں سے ایک میں یہ غزل تھی، جس کا مطلع ہے ؎

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

یہ شعر مجھے کچھ ایسا بھلا لگا کہ زبانی یاد ہو گیا۔ غزل کے باقی شعر تو اب بھی ذہن میں نہیں ہیں، لیکن یہ مطلع دل پر اس طرح نقش ہے جیسے تینتیس چوبیس برس پہلے تھا، اس کے دل پر نقش ہونے کی وجہ یقیناً اب وہ نہیں ہے جو پہلے

تھی، پہلے مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ شعر کس کا ہے، اب جانتا ہوں کہ یہ افسر الشعراء، آغا شاعر قزلباش کا ہے اور اس شعر کو پڑھ کر میرے ذہن میں جو نقش بنتا ہے، اس میں ان ساری شاعرانہ رنگینیوں اور فنی لطافتوں کا امتزاج ہے، جو آغا شاعر کی غزل گوئی کی خصوصیات ہیں۔ آغا شاعر کی غزل گوئی محبت کے اس جذبے کی ترجمانی کرتی ہے جس نے نہ الوہیت کے گہوارے میں پرورش پائی اور نہ روحانیت کی گودوں میں پلا بڑھا ہے۔ اس محبت میں بقول شخصے فلاکت بھی نہیں، یہ محبت ہماری آپ کی دنیا میں رہنے والے ایک جذباتی انسان کی محبت ہے، اس کا محبوب دنیائے آب و گل سے دور بہت دور کسی ایسی دنیا میں رہنے بسنے والا محبوب نہیں، جہاں آہوں کے دھوئیں کے سوا اور کسی چیز کی رسائی نہ ہو اس دنیا میں رہتے بستے ہوئے بھی ایسا ہو کہ جب وہ پاس آئے تو اسے ہاتھ لگائے نہ بنے اور جب وہ آئے (جس کی بے وفائی کے ہزاروں شکووں سے دل بے سماں کا ہر تار بکھرا ہوا ہو) تو زبان گنگ ہو جائے اور مسیحا یہ سمجھ کر واپس چلا جائے کہ بیمار کا حال تو اچھا ہے، آغا شاعر قزلباش کی غزلوں کا محبوب بھی (ان کے استاد کے محبوب کی طرح) ایسا محبوب ہے جس کی اداؤں پر پیار تو آتا ہے، لیکن محض اس لئے کہ وہ محبوب ہے، اسے الوہیت کی حدوں تک نہیں پہنچا دیا جاتا۔ اس کی دلداری کی جاتی ہے، آنکھیں اس کی راہ میں بچھائی جاتی ہیں لیکن اس سے کوئی شکایت ہوتی ہے تو اس سے شکوے بھی کئے جاتے ہیں اور ایسے انداز میں کئے جاتے ہیں جو سماوی نہیں ارضی ہے۔ شکوے کا وہی ارضی انداز اس مطلع کے دونوں مصرعوں میں موجود ہے۔

پہلے میں محبوب کی ارضیت کی تصویر ہے اور دوسرے میں عاشق کی اس جذباتی اور ذہنی کیفیت کی ترجمانی جو انتہائی مایوسی اور شکستہ دلی سے پیدا ہوتی ہے، مایوسی اور شکستہ دلی کے زخموں کا مداوا طنز کے مرہم سے کرتی ہے۔ طنز آغا شاعر کی غزل گوئی کی ایک خصوصیت ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بُرے حال سے، یا بھلے حال سے ؛ نہیں کیا، ہماری بسر ہو گئی

سدھاریں، بھلا آپ کیا دیکھتے ہیں؟ جنازہ کسی کا، تماشا کسی کا

سنبھالا نہ تم نے، اجل نے جلایا ؛ کہیں کام رکتا ہے داتا! کسی کا؟

اٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے ؛ بڑا پیار تھا، پیار دیکھا تمہارا!

بلو تم اگر کوئی مشکل نہیں ہے ؛ مگر کیا کرو۔ بیمار کا دل نہیں ہے

بات ذرا بے ربط سی ہے، پھر بھی جی چاہتا ہے کہ دو تین ایسے اشعار سنا کر آگے بڑھوں جن میں طنز کا مخاطب عارضی محبوب نہیں بلکہ ایک ایسی ذات ہے جو طنز و تشنیع سے بے نیاز اور ارضی علائق سے بالاتر ہے۔

جو برق و باد پہ قادر، وہ اِس قدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

ہم جِلائے گئے ہیں مرنے کو ٭ اس کرم کی سہار کون کرے

حشر میں انصاف ہوگا، بس یہی سنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے، کچھ وہاں ہو جائے گا

تیسرے شعر میں طنز کی جو تلخی ہے، اس کے پردے میں ایک شوخ کرن کی جھلک ہے۔ یہی شوخ کرن آغا شاعر کی غزلوں میں تغزل کا وہ مفہوم پیدا کرتی ہے، جسے سب سے پہلے ہمارے غزل گو شعرا میں جرأت نے شروع کیا، مومن کے مخصوص انداز نے اسی رنگ کو شوخی میں متانت اور شکایت میں بلاغت اور معنی آفرینی کے جوہر شامل کر کے اسے جِلا دی پھر آگے چل کر جرأت اور مومن کے دو رنگوں کو ملا کر ایک سنہرے روپہلے طرز کی بنیاد داغ نے رکھی، داغ کے اس شوخ و شنگ رنگ کو داغ کے شاگردوں میں آغا شاعر نے اس حسن و خوبی سے قائم رکھا کہ بیسویں صدی کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت بن گیا۔ اس طرز کے کچھ پہلو یقیناً ایسے ہیں جن پر ثقہ سے ثقہ پڑھنے اور سننے والے بھی سر دھنتے ہیں۔ اس طرز کے لکھنے والوں نے زبان کی سادگی، بے تکلفی، روزمرہ، اور ان ساری چیزوں سے پیدا ہونے والی گھلاوٹ اور لگاوٹ سے جو کام لیا ہے اس سے تغزل کے حسن میں ایک جذباتی کشش پیدا ہوتی ہے، اور گو ہم اپنی پردہ داری کے خیال سے اس کشش کو کشش نہ کہیں، بالظاہر اس حسن سے جگمگاتی

ہوئی بزموں کے رقص و نغمہ میں ڈوب کر اپنی برتری کے احساس کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں مصروف رہیں، لیکن یہ خواہش ہر ایک کے دل میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے کہ اس بزم کے حسنِ رنگیں کی جھلک کسی نہ کسی طرح نظر آجائے، اس لئے اس رنگین جھلک میں بھی بہت کچھ ایسا ہے جو ہمارے دلوں سے قریب ہے ہماری انسانی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔ آغا شاعر کی غزل گوئی فطرتِ انسانی کے اسی پہلو کو بے تکلفی سے لیکن شاعرانہ انداز میں ہمارے سامنے لاتی ہے یہاں احساس تو ایک معمولی انسان کا ہے لیکن بیان شاعر کا، اور جب یہ دونوں چیزیں مل جائیں، شعر میں لذت کا پیدا ہو جانا یقینی ہے، کچھ شعر سنیئے

پھر مرے سر کی قسم کھا کر چلے
پھر مجھے سرکار نے فقرا دیا

کوستے ہیں ستانے والے کو
آپ سے تو کوئی خطاب نہیں

کہاں نصیب یہ شاعر، وہ دردِ دل پوچھیں
میں مسکرا کے کہوں "ہاں حضور، ہوتا ہے"

دو اجازت تو کلیجے سے لگالوں رخسار
سینک لوں چوٹ جگر کی انہیں انگاروں پر

پھر تڑپنے لگا دلِ مضطر ؛ پھر لگا ہیچ ہم کو جینے سے

تم بھلا کون تھے دل میں مرے آنے والے
دیکھنا، جان نہ پہچان، چلے آتے ہیں

مجھ سے پوچھے کوئی میں بات بتا دوں دل کی
اس لئے رُوٹھ رہے ہیں کہ منائے کوئی

اِن سارے شعروں میں عاشق اور محبوب کا رشتہ شروع سے آخر تک ارضی خصوصیات کا حامل ہے، اس میں ہر جگہ گہری محبت ہی باقی ہر چیز سے زیادہ تقاضائے بشری کا پرتو ہے، عاشق محبوبِ دلنواز کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے میں ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں کرتا، لفظوں کے حریری پردوں میں سے بھی انسانی فطرت کی شوخی اور بے باکی صاف جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس شوخی اور بے باکی میں بھی وہ حفظِ مراتب موجود ہے جو حسن اور عشق کے رشتے میں ایک کو نیاز دوسرے کو ناز، ایک کو خادم دوسرے کو مخدوم اور ایک کو عاشق دوسرے کو محبوب بناتا ہے، پھر
مجھے سرکار نے فقرا دیا —— آپ سے تو کوئی خطاب نہیں
میں مسکرا کے کہوں ہاں حضور ہونا ہے —
اِن تینوں مصرعوں میں جہاں ایک طرف اس ارضی تعلق کی جھلک ہے

جب میں نے آغا شاعر کی غزل گوئی کی خصوصیت کہا ہے، وہاں دوسری طرف نیاز و ناز کے باہمی تعلقات کا حفظِ مراتب بھی ہے، اس کے بعد کا شعر بھی ہے ؎

دو اجازت تو کلیجے سے لگا لوں رخسار
سینک لوں چوٹ جگر کی انہیں انگاروں پر

اس میں "دو اجازت" کے ٹکڑے کی بلاغت قابلِ داد ہے۔

اس طرح سے اگلے شعر کا دوسرا مصرع — پھر لگا لیجے ہم کو سینے سے ایک گذری ہوئی طویل اور رنگین کہانی کا معنی خیز ٹکڑا ہے۔

اس کے بعد دونوں شعروں میں شوخی یقیناً زیادہ ہے لیکن اس شوخی میں بھی کسی اور بات سے زیادہ یہ پہلو نمایاں ہے کہ حسن و عشق کا باہمی رشتہ دار بنا کر رکھنے کی چیز نہیں۔

یہ آغا صاحب مرحوم کی غزل گوئی کے صرف دو رخ ہیں انہیں دیکھ کر غزل میں مطالب کی تجسس کرنے والوں کو شاید پوری تسکین نہ ہو اس لئے ان کے تھوڑے سے شعر اور سن لیجئے مجھے یقین ہے کہ یہ شعر پڑھ کر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جس نے عشق و محبت کی ترجمانی میں زندگی بشریت اور ارضیت کو نہیں چھوڑا، دنیا کے دوسرے حقائق سے بے تعلق رہنا بھی اس کے بس کی بات نہیں، زندگی کے متعلق آغا شاعر کے شعر سنئے

زندگی ہے ہزار غم کا نام ٭ اس سمندر کو پار کون کرے

تنکے کی طرح سیلِ حوادث لئے پھرا

طوفان لے کے آئے تھے ہم زندگی کے ساتھ

یہ دو اشعار محض خیال آرائی کا نتیجہ نہیں، بلکہ شاعر نے زندگی کے طوفان اور سیلِ حوادث کے تھپیڑوں سے دوچار ہو کر اپنے تجربوں کو شعر کا لباس پہنایا ہے، یہی شاعر جب زندگی کے اس طوفان میں مناظرِ قدرت کی جھلک دیکھتا ہے تو پکار اٹھتا ہے۔

کبھی ساون کی جھڑی ہو، کبھی بھادوں برسے

ایسا برسے مرے اللہ کہ چھاجوں برسے

اُف رے شبنم، اس قدر ناقدریاں ؟ موتیوں کو گھاس پر پھیلا دیا

کہیں دریا، کہیں صحرا، کہیں پربت، کہیں گلشن

کہیں موتی سا پانی، اس پہ آنچل سبز کائی کا

کچھ اشعار یونہی بے ربط بے سلسلہ اور سن لیجئے، ان میں بھی زندگی کے طوفان اور سیلِ حوادث کی جھلکیاں ہیں، اور اصل میں یہی جھلکیاں ہیں جو تصویر کو مکمل بناتی ہیں۔

اے شمع ہم سے سوزِ محبت کے ضبط سیکھ ؛ کمبخت ایک رات میں ساری پگھل گئی

تو ہم بتائیں غنچہ و گل میں ہے فرق کیا ۔ اک بات ہے کہی ہوئی، اک بے کہی ہوئی
اس واسطے تھم تھم کے ہے جاری نفس اپنا ۔ آہوں سے کہیں ٹوٹ نہ جائے قفس اپنا
کہاں تک سختیاں جھیلے کوئی قیدِ علائق کی ۔ نکل جاؤں گا اک دن توڑ کر دیوارِ زنداں کو
برقِ خرمن سوز، ابرِ گھن، ذرا چشمِ کرم ۔ چار تنکے پھر جڑے ہیں آشیانے کے لئے
گھٹا جاتا ہے دل ضبطِ فغاں سے ۔ بنے جاتے ہیں نالے ہچکیاں سے

آغا شاعر قزلباش کو اردو والے ایک غزل گو کی حیثیت سے جانتے ہیں جن کی غزلیں رنگین محفلوں کو رنگین بناتی ہیں اور جن کے شعر پڑھ کر اب بھی لوگ سر دھنتے ہیں، اُن کی غزلوں کا دیوان مخزن پریس سے "تیر و نشتر" کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا یہ شائد بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آغا شاعر نے کلامِ پاک کا منظوم ترجمہ کیا تھا، جس کے دو تین پارے شائع بھی ہو چکے ہیں، عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ رباعیوں میں کیا جو "خمکدۂ خیام" کے نام سے چھپ چکا ہے، اور یہ کہ انہوں نے نثر نظم سے بھی زیادہ لکھی ہے، وہ مخزن کے مشہور لکھنے والوں میں سے تھے، اُن کے رنگین شاعرانہ اور پُر کیف مضامین کا مجموعہ "خمارستان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس مجموعے میں سینتیس ۳۷ مضامین ہیں، کچھ خالص ادبی اور تنقیدی، کچھ بیانیہ کچھ تخیلی اور کچھ دہلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق، ان سارے مضامین کا موضوع ایک سا نہیں، لیکن ایک چیز ہے جو ہر مضمون میں بے حد نمایاں ہے اور وہ ہے آغا شاعر کی شاعرانہ فطرت۔ آغا شاعر نے ہر چیز کو شاعرانہ نظر سے دیکھا اور محسوس کیا ہے، مناظرِ فطرت دہلی کی اُجڑی ہوئی بزموں کے دلدوز تصورات حسنِ اخلاق کے دلنشین سبق، ادب کی بیتی ہوئی صحبتوں کی یاد، ان سب چیزوں کو

پڑھ کر لکھنے والے کے احساس اور بیان کی شاعرانہ رنگینیں دل پر گہرا اثر کرتی ہیں، لکھنے والے نے مشاہدات و محسوسات کو چھوٹے چھوٹے شاعرانہ فقروں میں بیان کیا ہے اور اس طرح اس کے دل کی بات دوسرے کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے، آغا شاعر کی یہ نثری خصوصیت اُن کے متعدد ڈراموں اور ناولوں میں بھی نمایاں ہے جن میں سے اکثر اب تک شائع نہیں ہوئے، یا شائع ہوئے ہیں تو اب اُن کا پتہ نہیں، اور کوئی جانتا تک نہیں کہ آغا شاعر نے ڈرامے لکھکر کبھی کبھی ان میں ہیرو کا پارٹ بھی خود ادا کیا ہے۔

بعض ڈرامے اور ناول ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کے ترجمے اب تک غیر مطبوعہ ہیں، یہ ساری باتیں بہت کم لوگ جانتے ہیں — اور یہ بات تو شاید بہت ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ افسرالشعرا آغا شاعر قزلباش بھی دلدار شاہ بادشاہ بھی تھے۔ ہماری یہ ساری بے نیازی اور بے خبری اس شاعر و ادیب کی طرف سے ہے جسے اس دنیا سے سدھارے ابھی سات ہی سال ہوئے ہیں (وفات ۱۲ر مارچ ۱۹۴۰ء) پھر دنیا کی کس چیز کا اعتبار ہو، کس پر بھروسہ کیا جائے، سوائے ایک ذات کے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور اسی کا نام سدا رہنے والا ہے۔ باقی سب کچھ فانی ہے۔

(منقول از "آجکل" ۱۵ر مارچ ۱۹۴۷ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

آغا شاعر میرے پرانے مہربان دوست تھے، اس لئے ان کی اپ لوگوں کو بھی اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔ ہوسکے تو ان کے کارنامے منظوم ترجمہ کلام اللہ کو چھپوائیے۔

(ابوالکلام آزاد منقول از چمنستان دلی ۱۹۴۱ء)

مولانا احتشام الحق تھانوی

افسر الشعراء آغا شاعر دہلوی مرحوم کا منظوم ترجمہ قرآن کریم کا ایک پارہ اس وقت میری نظر کے سامنے ہے چیدہ چیدہ مقامات کا میں نے مطالعہ بھی کیا ہے، جہاں تک ترجمہ اور اظہار معنا کا تعلق ہے، اس کے معیاری ہونے کے لئے یہی سند کافی ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نثر ترجمہ منظوم کی اصل ہے، اور یہ بالکل قدرتی بات ہے۔ نثر کا دامن جسقدر وسیع ہے اسی قدر نظم کا دامن تنگ ہے، اسی لئے فقہاء نے نظم میں ترجمے کی اجازت نہیں دی، مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ آغا صاحب مرحوم نے شاہ صاحب کے ترجمے کو جس کمال کے ساتھ نظم کیا ہے اس کی بناء پر یہ منظوم ترجمہ قرآن کریم کی بہترین "ترجمانی" کہا جاسکتا ہے۔

حق تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

بندہ احتشام الحق تھانوی

۲۶ اپریل ۱۹۶۵ء کراچی

خواجہ حسن نظامی دہلوی

آج جناب آغا شاعر نے ایک عجیب و غریب چیز سنائی، یعنی قرآنِ پاک کا منظوم اردو ترجمہ، نہایت شیریں، بامحاورہ اور مؤثر فقرے ہیں لیکن بعض مقامات پر سیاقِ عبارتِ الٰہی کی پیروی میں مشکلات پیش آئی ہیں جس کے لئے میں نثر کا ترجمہ بھی شامل کرنے کی صلاح دیتا ہوں۔

درحقیقت جنابِ آغا کو جو عبورِ زبانِ اردو پر ہے اس کی بناء پر ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ منظوم ترجمۂ قرآن شریف اردو زبان میں سب سے پہلا اور بے مثل ترجمہ ہوگا۔ جس سے مسلمانوں کے بچے، عورتیں اور معمولی سمجھ کے افراد مطالبِ قرآنی کو حفظ کرنے میں آسانی حاصل کرسکیں گے۔

حسن نظامی

(میرٹھ - ۱۳ ؍ جولائی ۱۹۱۳ء)

مولوی عبدالحق

مشفق خان صاحب لطیف احمد جرّیج

تسلیم! آپ کا پہلا خط اور پارۂ سیقول کا منظوم ترجمہ پہنچ گیا۔ جواب اس لئے ابھی تک نہیں دیا تھا کہ میں ترجمے کو پڑھ لوں تو لکھوں۔

اب میں نے وہ منظوم ترجمہ دیکھ لیا، بے شک ترجمہ اچھا ہے اور بہت احتیاط سے کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے لئے ایسا پبلشر ملنا، کہ کچھ معاوضہ بھی دے اس وقت نہیں مل سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ یہاں کے سررشتہ امور مذہبی سے کچھ امداد ہو، اس کے لئے مہینوں اور برسوں کی کوشش درکار ہے، سخت پیروی کی ضرورت ہے۔ اِس کی مجھے فرصت نہیں۔

عبدالحق

نقل خط از مولوی عبدالحق (بابائے اردو) صدر انجمن ترقی اردو مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۷ء۔ بنام خان صاحب لطیف احمد جرّیج انسپکٹر مدارس امراوتی (برار)

شمس العلماء مولوی عبد الرحمٰن

پروفیسر عربی مشن کالج دلّی

اس منظوم ترجمہ کلام اللہ شریف کے ایک پارہ کا ترجمہ میں نے پہلے بھی دیکھا تھا، اور اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اس وقت تو خیال یہ تھا کہ شاید آئندہ ترجمہ بایں زور و خوبی نہ ہو سکے گا، لیکن سچ یہ ہے کہ جو ترجمہ اس وقت اور دو پاروں کا میرے سامنے ہے، اسی پہلے ترجمے کا ہم پایہ ہے، اور جناب آغا صاحب نے معارف قرآنیہ کو جو نثر میں بھی ادا نہیں ہو سکتے اپنی انتہائی کوشش و کاوش سے وزن و قوافی کی قیود کے باوجود اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

ہاں اس منظوم ترجمے میں وہ تمام خوبیاں از قسم سلاست و فصاحت وسعت زبان و زور بیان موجود ہیں، جو قرآن مجید کے ایک ترجمے میں زیادہ سے زیادہ ہو سکتی ہیں اس لئے عام شائقین ترجمہ نظم کے علاوہ واعظین اور مبلغین کے لئے بھی یہ ترجمہ نہایت کام کی چیز ہے۔ بلکہ نثر کا ترجمہ بھی نظم سے پہلے موجود ہے۔ اس لئے ہر اردو داں مسلمان آغا صاحب کے ان مطبوعہ پاروں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

امید ہے کہ ہر اہل علم اور ادب سے واقف جمہور مسلمان اور خواتین اس ترجمۂ منظوم کی ایسی ہی قدر کریں گے جس کا کہ وہ مستحق ہے۔

(دلّی - ۱۲ - اسمبر ۱۹۳۷ء)

مفتی عبدالقدیر قادری بدایونی

مفتی اعظم حیدر آباد دکن

آغا شاعر صاحب دہلوی جنہوں نے یہ منظوم ترجمۂ کلام مجید کیا ہے اردو شاعری میں جو بلند پایہ رکھتے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس میں ضرور کامیاب ہوں گے، بلکہ میری دعا ہے کہ مولا یعنی اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے اور عام اہلِ اسلام اس سے مستفیض ہوں۔ گو اکثر علمائے مصر کا یہ خیال ہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں۔ بایں ہمہ قرآن کریم چونکہ تمام اقوام و ملل کے لئے شمع ہدایت بن کر آیا ہے۔ اس لئے ایک ایسی موزونیت کا حامل ضرور ہے کہ وہ ہر تشنہ کام کو سیراب ضرور کر دیتا ہے۔

ترجمہ کہیئے یا تفسیر، بہر حال افہام و تفہیم کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ دیگر السنہ میں مطالب قرآنی کو پیش کیا جائے۔

اس وقت تک فارسی، اردو، ترکی، ہندی، گجراتی کے سوا دیگر اور زبانوں میں بھی جو تراجم اور تفاسیر شائع ہوئے ہیں وہ سب کے سب نثر میں ہیں۔ کم از کم میری نگاہ سے تو کوئی منظوم ترجمہ نہیں گذرا۔ اس لئے جناب آغا شاعر صاحب نے یہ پہلی کوشش کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی کوشش اور سعی کو بار آور کرے، اس میں ذرا شک نہیں کہ نثر کے مقابلے میں نظم بہت زیادہ دلپذیر اور سہل الحصول ہوتی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں وہ حضرات جن کو مطالب قرآنی سمجھنے کا ذوق ہے، مگر سوئے اتفاق سے وہ عربی داں بھی نہیں ہے تشک، ان کے لئے یہ نظم زیادہ کار آمد ہو گی بلکہ اہل

تبلیغ اور واعظین اور معانی کرنے والوں کے لئے بھی یہ ازبس مفید ہوگی۔

عبد القدیر بدایونی

۱۷ر مارچ ۱۹۳۶ء

مفتی کفایت اللہ

صدر جمعیۃ العلمائے ہند

میں نے جناب آغا شاعر دہلوی کا منظوم ترجمۂ قرآنِ کریم دیکھا، اگرچہ فاضل مترجم نے اپنا منظوم ترجمہ طبع کرنے سے پہلے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ نثر کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ رکھ دیا ہے، تاہم نظم کو بھی ترجمہ ہی کا لقب دیا جائے گا۔

آغا صاحب کی نظم قرآنِ مجید کا حاصل ادا کرنے میں اچھی نظم ہے۔ اور پارۂ الٓمٓ کے متعلق بلکہ ربع اوّل کے لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آغا صاحب نے قرآنی مفہوم کو خوبی اور صحت کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔

کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

(منقول از اخبار "منادی" دلی)

۲۰ر نومبر ۱۹۳۶ء

ہماری دیگر مطبوعات

ماضی کے مزار

تصنیف سید سبط حسن

مشرقی تہذیبوں کے بارے میں مغربی زبانوں میں بیشمار کتابیں ہیں لیکن اردو زبان کا خزانہ ان بیش قیمت نوادر سے ہنوز خالی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اجداد کے اقدار حیات طرز معاشرت اور انداز فکر و احساس سے بڑی حد تک بےخبر ہیں

اس کتاب میں وادئ دجلہ و فرات، شام و فلسطین اور مصر کی قدیم تہذیبوں کے بعض اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے عقائد و ادب کے اُن عناصر سے بحث کی گئی ہے جو ہمارے بعض مروجہ عقائد کی اساس ہیں تاکہ وہ تاریخی پس منظر نمایاں ہو جائے جس میں ان عقیدوں نے پرورش پائی ہے اور ان کے معاشی، سماجی اور تہذیبی محرکات بھی کھل کر سامنے آجائیں۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے عام پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور دانشور حضرات بھی لطف اندوز ہو سکیں گے

سائز $\frac{23 \times 18}{8}$ ضخامت ۲۴۶ صفحات قیمت بیس روپے

غبارِ کارواں

تصنیف اشرف صبوحی دہلوی

بہت مدت کے بعد دہلی کی رواں دواں شستہ بامحاورہ اور یوں کہنا چاہئے کہ کوثر میں دھلی ہوئی زبان کا مزا اس کتاب میں پایا۔ اشرف صبوحی خود اس کارواں کے پسماندہ مسافروں میں سے ہیں جن میں راشد الخیری، ناصر نذیر فراق،

حسن نظامی اور دوسرے اہل فکر و نظر بہتر رنگ نمایاں نظر آتے ہیں اشرف صبوحی کی زبان قلعہ معلیٰ کی زبان ہے یا نہیں اس پر بحث کر لیجئے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی زبان دہلی کے شرفاء کی زبان ہے اگرچہ ان کے خاکوں میں ذکر عام آدمیوں کا بھی ہے لیکن اس متانت، رکھ رکھاؤ اور احتیاط کے ساتھ ان کا قلم چومنے کو جی چاہتا ہے اُردو کی قوت بیان پر یہ کتاب ایک زندہ دلیل ہے۔ کاش! اشرف صاحب اس طرح کی ایک دو کتابیں اور لکھ کر مغربی پاکستان والوں پر احسان کریں اور انہیں بتا اور جتا سکیں کہ اردو کسے کہتے ہیں۔

قیمت پانچ روپے پچھتر پیسے　　　　　اخبار ندائے ملت لاہور

اُجڑا دیار

تصنیف شاہد احمد دہلوی

دلی بار بار اُجڑی اور اُجڑ اُجڑ کے بسی لیکن ۱۹۴۷ میں کم از کم پاکستان کے مسلمانوں کے لئے تو ہمیشہ کے لئے اُجڑ گئی۔ شاہد احمد مرحوم اسی اُجڑے دیار کے روڑے تھے۔ وہ بھی دلی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے اور ملا واحدی کے الفاظ میں "ان کے سینہ پر زخم پڑ گئے تھے انہوں نے ان زخموں کو کرید کرید کر جو لکھا وہ اپنے پورے تاثرات کے ساتھ ہمارے سامنے ہے"۔ شاہد صاحب کے انہی زخموں کے تاثرات کے مجموعے کا نام "اُجڑا دیار" ہے جو ۲۵ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین شاہد صاحب نے مختلف اوقات میں لکھے تھے۔ ان میں دہلی کی تہذیبی تاریخ بھی ہے اور دہلی مرحوم کا مرثیہ بھی۔ ایک ایسا مرثیہ جس کا دھیما دھیما انداز قاری کے دل میں ایک لطیف گداز پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کو اشکبار کر دیتا ہے دلی کا ذکر اور شاہد احمد کی زبان۔ ایک بار پڑھنے سے دل نہیں بھرتا

بار بار پڑھنے اور سر دُھننے کی چیز ہے۔

مضامین کے عنوان یہ ہیں :۔ دلّی کے چٹخارے، دلی کے دل والے، دلّی کی گرمی، فالیز کی سیر، باغ کی سیر، قطب صاحب کی سیر، پھول والوں کی سیر۔ چوک کی بہار، شام کی چہل پہل، چٹورپن، دلّی کے حوصلہ مند غریب، دلّی والوں کے شوق، رہن سہن کی ایک جھلک، بھانڈ اور طوائفیں۔ دلی کا ایک شریف گھرانہ۔ دلّی کی ایک پُرانی حویلی، دلّی کے چند گیت، روزہ کشائی، میٹھی عید، سلونی عید، بسنت کی بہار، سترھویں کی سیر، راگ رنگ کی ایک رات، دلّی کا آخری تاجدار، شاہجہانی دیگ کی کھرچن، دلّی کا غُسل خونیں عنوانات ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب دلی کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویر ہے۔ جو دہلی کی زبان کے ایک اہم نمائندے نے اپنے خون جگر سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کی ہے اس میں دلی کے دل والوں کا منچلا پن بھی ہے اور دہلی کی تباہی کی دلخراش روئداد بھی۔ دہلی کے گلی کوچوں کی چہل پہل بھی ہے اور دلی کے دل والوں کا منچلاپن بھی ہے اور دلّی کے غریبوں کا تذکرہ بھی۔ دہلی کے اہل کمال کی صحبتوں کا ذکر بھی ہے اور کبابیوں اور نہاری والوں کی چٹپٹی باتیں بھی اس کتاب میں شاہد صاحب کا سادہ، دلکش، پر اثر اور منظر کش طرز تحریر اپنی بلندیوں کو چھو رہا ہے قیمت دس روپے

ہمدرد ڈائجسٹ

چلتے ہو تو چین کو چلیے

تصنیف ابن انشاء

ابن انشا نے اپنے قارئین کے لئے بیش قیمت معلومات ہی فراہم نہیں کیں اپنے دلکش اسلوب نگارش سے بھی پڑھنے والوں کو لطف اندوز کیا ہے اہل چین کی حب الوطنی اولوالعزمی ان کی سادہ مگر جفاکش زندگی، ان کی اقتصادی ترقی اور اُن کے کردار

کی بلندی کے ایسے جاندار جاذب توجہ نقوش ابھارے ہیں کہ بےساختہ واہ نکل جاتی ہے۔

ماہنامہ کتاب لاہور

ابن انشاء نے جہاں کہیں چین کے لوگوں اور ان کے مزاج کی بعض خوبیوں کا اپنے ملک کی بعض خرابیوں سے موازنہ کیا ہے وہ بےحد دلچسپ ہے ہنس ہنس کر تیر چلانے اور بوجھو تو جانے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس سفر میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب خود مصنف بھی بوجھو تو جانے کے چکر میں پھنس جاتا ہے اور وہ یوں کہ جب مصنف شاعرانہ جذبات میں کھو کر چینی عورت کی کم سنی پر غور کرتا ہے اور عمر پوچھ بیٹھتا ہے تو پندرہ سولہ برس کا سن چالیس سے اوپر نکلتا ہے شاعر یقین نہیں کرتا اور وہ آخر تک یہی سمجھتا ہے کہ ہمارے ملک میں عمر بتاتے وقت ۲۰ سال کم بتائی جاتی ہے۔

اخبار "امروز" لاہور

قیمت چھ روپے

ادب اور زندگی

تصنیف مجنوں گورکھپوری

حضرت مجنوں گورکھپوری اردو نقادوں میں مینار نو کی حیثیت رکھتے ہیں انہوں نے قدیم و جدید انداز تنقید کو اس طرح سمو دیا ہے جس سے اردو تنقید فانوس حسن کی طرح رچ گئی ہے۔ ادب اور زندگی مجنوں صاحب کی جوان نگارش کا حقیقت آفرین مرقع ہے۔ یہ کتاب کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ قیمت دس روپے۔

روشن کا کارنامہ

بچوں کے لئے سبق آموز، دلچسپ جاسوسی ناول، اغوا کرنے والوں کے خلاف ایک دلیر بچے کی ذہانت کے حیرت انگیز کارنامے۔

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبر ۲ وکٹوریہ روڈ کراچی ۳

چلتے ہو تو چین کو چلئے

ابن انشا نے اپنے قارئین کے لئے بیش قیمت معلومات ہی فراہم نہیں کیں اپنے دلکش اسلوب نگارش سے بھی پڑھنے والوں کو لطف اندوز کیا ہے۔ اہل چین کی حب الوطنی اولوالعزمی ان کی سادہ مگر جفاکش زندگی، ان کی اقتصادی ترقی اور ان کے کردار کی بلندی کے ایسے جاندار جاذب توجہ نقوش ابھارے ہیں کہ بیساختہ واہ نکل جاتی ہے۔

ماہنامہ کتاب لاہور

تحریر میں طنز و مزاح کی شیرینی، بیان کی بیساختگی، زبان کی شگفتگی اور واقعات کا جو اسلوب ہے وہ منفرد بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ایک نظر دیکھئے تو یہ کتاب شگوفوں کا گلدستہ پھلجڑیوں کی پٹاری اور لطیفوں کا مجموعہ لگے گی۔ ایک ایک ورق الٹتے جائیے اور تمام چین کے حالات خواب گراں سے بیداری کے واقعات، انقلاب کی حکایت، طنز بلیغ اور مزاح لطیف، مسکراتے جملوں اور فقروں میں معلوم ہوں گی۔ پہلے صفحے سے آخر تک پڑھ جائیے اکتاہٹ ایک لمحہ کے لئے بھی محسوس نہیں ہوتی قاری مصنف کے نہیں بلکہ وادی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ

ابن انشا نے جہاں کہیں چین کے لوگوں اور ان کے مزاج کی بعض خوبیوں کا اپنے ملک کی بعض خرابیوں سے موازنہ کیا ہے وہ بیحد دلچسپ ہے ہنس ہنس کر تیر ملانے اور بوجھو تو جانے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس سفر میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب خود مصنف بھی بوجھو تو جانیں کے چکر میں پھنس جاتا ہے اور وہ یوں کہ جب مصنف شاعرانہ جذبات میں کھو کر چینی عورت کی کم سنی پر غور کرتا ہے اور عمر پوچھ بیٹھتا ہے تو پندرہ سولہ برس کا سن چالیس سے اوپر نکلتا ہے۔ شاعر یقین نہیں کرتا اور وہ آخر تک یہی کہتا ہے کہ ہمارے ملک میں عمر بتاتے وقت چھ سات سال کم بتائی جاتی ہے۔

اخبار امروز۔ لاہور